
مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب اور اس کا حل
ڈاکٹر سید ابوذر کمال الدین

نام کتاب

مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب اور اس کا حل

مصنف

ڈاکٹر ابوذر کمال الدین (پی ایچ۔ڈی معاشیات)

صفحات: ۱۱۶   قیمت: ۲۹/- روپے

طبع اول: جولائی ۲۰۰۳ء

باہتمام

ناصر خان

ناشر

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Phone: 23289789, 23289159 Fax: 23279998 Res. : 23262486
e_mail : farid@ndf.vsnl.net.in • farid_export@hotmail.com
Website: www.faridexport.com • www.faridbook.com

Name of the book

Musalmanon Ki Zubunhali Ke Asbab Aur Uska Hul

Author:

Dr. Abuzar Kamaluddin (Ph.D. Economics)

Pages: 116   Price: Rs. 29.00

Printed at: Farid Enterprises, Delhi-6

ترتیب

مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب اور اس کا حل

☆ ☐ ☆

عرض ناشر

ڈاکٹر ابوذر کمال الدین صاحب کا آبائی وطن سمستی پور (بہار) موضع ڈیرھیابلار ہے، موصوف صالح، ذہین اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ بہار یونیورسٹی سے معاشیات (Economics) میں امتیازی پوزیشن سے ایم۔اے کرنے کے معا بعد مظفر پور کے معروف آر۔ڈی۔ایس کالج میں معاشیات کے لکچرر ہوئے۔ بعد ازاں انہوں نے اسلامی معاشیات میں ڈاکٹریٹ کا اعزاز حاصل کیا۔ ڈاکٹریٹ سے قبل ریسرچ کے سلسلے میں ایک بار انھوں نے انگلینڈ کا سفر بھی کیا۔ صوبہ بہار کے دو معروف ڈگری کالجوں میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ فی الوقت وہ بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کونسل میں وائس چیئرمین کے عہدے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر ابوذر کمال الدین کی شخصیت صالح اسلامی معاشرے کی تعمیر میں بے حد نمایاں رہی ہے۔ وہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں بہار کی ایک معروف اسلامی تنظیم حلقہ طلبۂ اسلامی (بہار) سے ایک طویل عرصے تک وابستہ رہتے ہوئے طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ایک بار وہ حلقہ طلبہ اسلامی (بہار) کے ناظم اعلیٰ بھی منتخب ہوئے۔ یہی طلبہ تنظیم بعد میں ایک ملک گیر طلبہ تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (S.I.O.) میں ضم ہوگئی۔

موصوف کو اللہ تعالیٰ نے تقریر وتحریر دونوں پر یکساں قدرت عطا کی ہے۔ ان کا تعلق معاشرے کے ہر طبقہ اور مکتب فکر کے علماء اور دانشوروں سے ہے اور غیر مسلم دانشوروں کی مجلسوں میں اسلام اور قومی یک جہتی کے موضوع پر خطاب بھی کرتے رہے ہیں۔ وہ پر امن سماج کی تعمیر کے سلسلے میں ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور سماج کو امن کا گہوارہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ فاضل مصنف قرآن، احادیث، سیرت نبویؐ اور اسلامی تاریخ کے علاوہ عالمی تاریخ اور عصری علوم و مذاہب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر وہ معاشیات کے استاذ ہیں لہٰذا ملک میں سماجی ومعاشی ترقی کے سلسلے میں انھوں نے نمایاں کام کیا ہے۔ لیکن ہر ترقی کو وہ ایک مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا کامل ایمان ہے کہ اسلام ہی وہ نظریہ ہے جو ہر لحاظ سے برتر، فائق اور عظیم نظامِ حیات رکھتا ہے لہٰذا سماج میں ہر طرح کی ترقی خواہ مادی ہو یا روحانی اسلام ہی کے ذریعے ممکن ہے تبھی سماج امن کا گہوارہ ہوسکتا ہے۔ اب تک مصنف کی دو کتابیں ایک اردو میں اور دوسری انگریزی میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں ''اسلام کا پیغام بھارت کے نام'' کی بے حد پذیرائی کی گئی۔

زیر نظر کتاب ''مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب اور اس کا حل'' فاضل مصنف کی گذشتہ کتاب ''امت مسلمہ کا مستقبل۔ ہدف، چیلنج اور ترجیحات'' کی دوسری کڑی ہے۔ دراصل یہ دونوں کتابیں ''ملت نامہ'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کتاب میں جہاں مصنف نے مسلمانوں کو خالص توحید عقیدہ رسالت اور آخرت پر جمے رہنے کی تلقین کی ہے وہیں موصوف نے معاشرے میں مسلمانوں کی تعلیمی معاشی، سیاسی اور سماجی و مذہبی بدحالی کے اسباب پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ موجودہ صورتحال میں یہ کتاب ''ملت نامہ'' کا مکمل پس منظر پیش کرتی ہے نیز اس میں مصنف نے دردمندی کے ساتھ امت کے افراد کو کچھ کرنے کی طرف آمادہ کرنے کی سعی کی ہے۔ توقع ہے کہ اس کتاب کو بھی ہر طبقے کی طرف سے بھرپور پذیرائی ملے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ یہ کتاب ملت کے حق میں رحمت ثابت ہو اور فاضل مصنف کو اس کا بہترین اجر ملے۔ آمین

ــــ ناصر خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب اور اس کا حل

تمہید

اس وقت ہندوستان کی مختلف قوموں اور برادریوں میں مسلمانان ہند سب سے زیادہ پس ماندہ اور درماندہ گروہ ہیں۔ یہ محض حد سے بڑھے ہوئے احساس کے نتیجے میں پیدا شدہ رائے نہیں ہے بلکہ تمام تر سرکاری دستاویزات، کمیٹیوں اور کمیشنوں کی رپورٹ سے واضح ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو اوپر اٹھانے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی گئی بلکہ ان کو فسادات وامتیازات (Riots & Dis-criminations) کی ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت نیچے رکھنے کی مسلسل اور مستقل کوشش جاری ہے۔ ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ کے سب سے نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ ایک طرف دشمنان دین وملت کا ایک گروہ ہے جو منظم طور پر ملت کو اور اس کی شناخت کو مٹانے کے درپے ہے اور نت نئی سازشوں کے ذریعہ اس کی عرصہ حیات تنگ کرتا جارہا ہے۔ دوسری طرف ملت کا سواد اعظم ہے جو غفلت اور بے حسی کے عالم میں مبتلا خواب خرگوش میں پڑا ہے۔ امت کے علماء، دانش وروں، صحافیوں، لیڈروں اور جماعتوں نے بھی ابھی تک ذمہ دارانہ طرز عمل کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ پوری ملت میں شعور، اتحاد اور اجتماعیت کا فقدان ہے۔ شخصی اور گروہی مفادات کا

بول بالا ہے۔ ملت کو یا تو چراگاہ سمجھ لیا گیا ہے یا بے زبان جانور جس کو کوئی بھی چند سکے کے عوض کسی کے کھونٹے سے باندھنے کو تیار ہے۔ یہ صورتحال کتنی سنگین ہے اور اس کے نتائج کتنے بھیانک ہوں گے" اس کے احساس سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس ناگفتہ بہہ صوتحال کی وجہ کیا ہے ؟ وہ کون سے اسباب و عوامل ہیں جس نے ملت کو اس مقام تک پہنچادیا ہے نیز ان کا تدارک کیا ہے ؟

میں اس مختصر سے مضمون میں ان وجوہات کو نکات وار پیش کروں گا جس نے اتنی بڑی آبادی کو اس کے شاندار روایات کے باوجود نشان عبرت بنادیا ہے کسی لمبی چوڑی تمہید میں جائے بغیر میرے نزدیک مسلمانوں کی موجودہ حالت زار کے مندرجہ ذیل وجوہات ہیں :

١. عقائد میں اضمحلال
٢. اسلامی عبادات واخلاقیات سے دوری
٣. تعلیم کی کمی
٤. سماجی انتشار
٥. معاشی بدحالی اور
٦. سیاسی قیادت کا فقدان

یہ فہرست اور بھی طویل ہو سکتی ہے اور اس میں دیگر تمدنی مسائل اور خارجی عوامل کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے لیکن چونکہ اس مضمون کا بنیادی مقصد خود احتسابی (Self Introspection) ہے اس لئے دیگر عوامل وعناصر کا ذکر ضمنی طور پر آئے گا۔ ہمارا بنیادی زور ان داخلی عناصر کی کھوج ہے جس نے ملت کو اندر سے کھوکھلا اور بے

وزن کر دیا ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جن کی اصلاح کئے بغیر ملت نہ زندہ رہ سکتی ہے اور نہ آگے بڑھ سکتی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ نکتہ واضح طور پر سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ مسلمان عام قوموں کی طرح صرف ایک قوم نہیں ہے جیسا کہ بہت سے غیر مسلم دانشوراور رہنما سمجھتے ہیں یا باور کراتے ہیں اور ان کے ذریعہ تربیت یافتہ بہت سے مسلمان دانشور بھی کچھ ایسا ہی سمجھنے اور ماننے لگے ہیں بلکہ مسلمان ایک مخصوص صاحب عقیدہ اکائی ہے جس کی اپنی کچھ الگ خاصیت اور پہچان ہے۔ اس خاصیت اور پہچان کو گم کر دیا جائے تو پھر اس کی انفرادیت اور اسکی شناخت گم ہو جائے گی۔ شیر بھی ایک جانور ہے اور گیدڑ، بندر، بلی، کتا، سور، بکری اور گائے بھی جانور ہیں لیکن ان تمام جانوروں کی خصوصیات الگ الگ ہیں اس لئے یہ سب جانور ہونے کے باوجود اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اگر ان کی ان خصوصیات کو نظر انداز کر دیا جائے تو شیر اور گیدڑ، سور اور بندر میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ ٹھیک یہی حال مسلمان اور دیگر قوموں کا ہے۔ وہ سب کے سب انسان ہیں۔ انسانی برادری کا حصہ ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے عقائد الگ ہیں۔ ان کی تہذیب الگ ہے۔ ان کا نظام عبادت الگ ہے۔ ان کے ضابطہ اخلاق الگ ہیں اس لئے ان کے درمیان بنیادی اور جوہری فرق ہے۔ کچھ چیزوں میں کچھ مماثلت ان کے ایک ہی طرح ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ انسان ہونے کے ناطے ایک انسان اور دوسرے انسان ہیں عقائد و نظریات کے اختلاف کے باوجود بہت ساری یکسانیت ہو گی مثلاً بھوک پیاس کا احساس، سردی گرمی کا احساس، پیدائش اور موت کا طریقہ، سانس لینے اور گردش خون کا انداز، بیماری وصحت کے اصول وغیرہ۔ ایک طرح کے

ہونے کے باوجود ہر نفس اپناالگ وجود رکھتا ہے اور ان سب چیزوں کو الگ الگ انداز سے محسوس کرتا ہے اور برتتا ہے۔ اس لئے اس اختلاف کو نظر انداز کر تمام امور کے بارے میں ایک ساحکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ماں، بہن، بیوی تینوں عورت ہے لیکن جو بات ماں کے ساتھ ہوگی وہ بیوی کے ساتھ نہیں ہوگی۔ جو بیوی کے ساتھ ہوگی وہ بہن کے ساتھ نہیں ہوگی۔ اسی طرح ایک ملک اور ایک سماج میں رہنے کے باوجود مختلف انسانی گروہوں کی جو خصوصیات ہیں ان کو صرف نظر کر کے نہ تو ہم ملک کا بھلا کر سکتے ہیں اور نہ قوموں کا۔ اس لئے ہمارا قومی مطمح نظر یک رنگی کے بجائے تنوع میں اتحاد ہونا ہی صحیح ہے کیونکہ اسی ذریعہ سے مختلف قومیتوں میں اعتماد اور تحفظ کی فضا پیدا ہوگی جو ملک کے اتحاد و سالمیت کو مستحکم اور پائیدار بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔

یہ بات اس لئے واضح کر دینا ضروری تھا کیونکہ بسا اوقات جب کسی مخصوص طبقہ کے اتحاد و ترقی کی بات کی جاتی ہے تو جن کا ذہن محدود نقطہ نظر پر قان زدہ اور تنگ ہے وہ اسے فرقہ پرستی پر محمول کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح کی کوشش کو بار آور ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہندوستان کے تناظر میں اس کی خاص اہمیت ہے کیونکہ ایسے عناصر ہندوستانی سماج و سیاست میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اپنی ملت کی بھلائی چاہنایا اس کو منظم و مستحکم کرنا اور اس کو ترقی دینا اگر یہ فرقہ پرستی قرار دی جائے تو پھر پورا ہندوستان اور اس کا ہر گروہ فرقہ پرست قرار پائے گا۔ اپنی ملت سے ہمدردی فرقہ پرستی نہیں ہے بلکہ اپنی ملت کی ہمدردی میں دوسروں کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کا برتاؤ کرنا فرقہ واریت ہے جس کا قلع قمع کیا جانا چاہئے۔

لہذا اس مضمون میں جان بوجھ کر دگر فرقوں اور برادریوں کے مسائل پر گفتگو

نہیں کی گئی ہے جس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں ان کی بھلائی اور ترقی سے دلچسپی نہیں ہے یا ہم ان کی قیمت پر اپنی ترقی چاہتے ہیں۔ بلکہ اس میں تخریجی اصول (De-ductive Principle) کے تحت صرف مسلمانوں کے مسائل سے بحث کی گئی ہے اور ان کی اصلاح و ترقی کی بات کی گئی ہے۔ اس طرح کی کوشش دیگر فرقوں اور قوموں کے باب میں بھی کی جانی چاہئے۔ ایک اور بات ذہن میں رہنی چاہئے۔ ہندوستان صرف دریاؤں پہاڑوں، جنگلوں کا نام نہیں ہے بلکہ اس خطہ ارضی میں بسنے والے انسانوں کا نام ہے جو مختلف اقوام اور برادریوں پر مشتمل گروہ ہیں تو جب تک سب کی ترقی نہیں ہوگی مجموعی طور پر اسے پورے ملک کی ترقی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ترقی کے اس دوڑ میں جو فرقہ، طبقہ، برادری اور قوم پیچھے رہ جائیگے ملک اسی تناسب میں پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہوگا۔ جس طرح ملک کی مجموعی ترقی کے لئے اس کے ہر علاقے (Region) کی ترقی ضروری ہے اسی طرح ملک کی مجموعی ترقی استحکام، اتحاد اور سالمیت کے لئے اس کے ہر طبقہ، فرقہ برادری اور قوم کی ترقی لازمی ہے۔ ورنہ یہی چیزیں عدم اطمینان اور شورش کا باعث بنے گی جس سے انتہاپسندی، دہشت گردی اور علیحدگی پسندی کے رجحان کو تقویت ملے گی جو کسی ملک کے لئے فال نیک نہیں ہے۔

مسلمان اس ملک کی پس ماندہ آبادی ہے۔ یہ ملک کے ہر حصہ اور خطے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد کہیں زیادہ اور کہیں کم ہے۔ ملک میں چاہے جس کی حکومت ہو مسلمانوں کے وجود کو نظر انداز (Wish away) نہیں کر سکتا اس لئے مسلمانوں کو ترقیاتی عمل میں پورا حصہ دینا یہ نہ صرف مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے، انصاف کے عین مطابق ہے بلکہ ملک کے حق میں بھی بہتر ہے۔ اس مضمون میں، میں

ابھی اس پہلو پر توجہ دینے کے بجائے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مسلمان خود کو کیسے اور کن بنیادوں پر استوار کریں تاکہ وہ ایک باشعور اور متحد اکائی بن کر ملک کے ترقیاتی عمل کا لازمی حصہ بن سکیں۔

مسلمانوں کی ایمانی کیفیت :

مسلمان ایک صاحب عقیدہ قوم ہیں جس سے ان کی ہیئت اجتماعی وجود میں آتی ہے ان عقائد سے صرف نظر کر کے مسلمانوں کی کوئی حیثیت اور اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے عقائد کیا ہیں اور ان کی موجودہ حالت کیسی ہے۔

توحید : مسلمان اس گروہ انسانی کا نام ہے جو خدا کو ایک مانتا ہے جس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں وہ اکیلا ہے اور آپ سے آپ ہے ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔ عرش کا مالک، زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں ہے سب اسی کی ملک ہیں۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ وہ تھکتا ہے۔ وہ سارے جہاں پر قدرت رکھتا ہے۔ زمین کے نیچے، کسی پتھر کے تلے اور ماں کی کوکھ میں کیا پل رہا ہے اس سے وہ پوری طرح واقف ہے۔ وہ انسان کے شہہ رگ سے قریب ہے اور دلوں کے راز تک سے آگاہ ہے۔ وہ سارے جہاں کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔ خلق اسی کی ہے اس لئے امر بھی اسی کا ہے۔ زندگی اور موت، رزق، صحت آرام اور تکلیف سب اسی کی طرف سے ہے۔ وہی ہواؤں کو چلاتا ہے۔ پانی برساتا ہے فصلیں اگاتا ہے۔ اسی کی قدرت سے پرندے پرواز کرتے ہیں چاند سورج کا نظام قائم ہے۔ اس کے ملک میں حقوق، اختیارات اور صفات میں کوئی شریک نہیں۔ دنیا کی اور قوموں میں بھی خدا کی وحدانیت

کا تصور پایا جاتا ہے لیکن یہ تصور ناقص ہے کیونکہ وہاں خدا کی وحدانیت خالص اور عملی (Absolute & functional) نہیں ہے بلکہ توحید کا تصور شرک کی بھول بھلیوں میں گم ہے۔ وہ ایک طرف، تو مانتے ہیں کہ خدا ایک ہے لیکن دوسری طرف بہت سے دیوی دیوتاؤں کو خدائی میں شریک مانتے ہیں۔ گویا خدائی کوئی جمہوری حکومت ہے جس میں ہر شعبہ کے الگ الگ منسٹر وزیر اور ذمہ دار ہیں جو اپنے دائرے میں بااختیار ہیں۔ گویا خدا پرائم منسٹر ہے اور باقی اس کے وزیر اور منسٹر جن کی بندگی اور عبادت کے بغیر خدا تک رسائی ناممکن ہے۔ یا پھر لوگوں نے خدا کو تقسیم کر کے اسے تین خانوں میں بانٹ دیا باپ بیٹا اور روح القدس، لہٰذا صرف باپ کی ہی نہیں بیٹے، بیوی اور روح القدس تینوں کی عبادت کرنی ہوگی۔ بعض لوگوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنا دیا اور بعض دوسرے انسانوں کو خدا کا بیٹا یا اوتار مانتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو خدا کو بھی توالد و تناسل کا پابند مانا گویا خدا دھرتی پر بار بار کسی نہ کسی کا بیٹا بنتا ہے۔ اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ وہ شادی کرتا ہے۔ اس کی نسل چلتی ہے پھر وہ مر جاتا ہے۔ بہت سے لوگ جو شرک کے اس گھورکھ دھندھے سے تنگ آگئے تو انہوں نے صاف صاف انکار کر دیا کہ اس کائنات کا کوئی خدا بھی ہے۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renais-sance) کے زیر اثر آئی بیداری نے اس تصور کو تقویت پہنچائی۔ کلسا سے جنگ ہوئی اور عقلیت نے کلسا کو شکست دیدی کیونکہ اس کا نظریہ بودا اور عقائد غلط تھے۔ پھر کمیونزم کا دار دورہ ہوا اور اس نے بے خدا سماج، سیاست، معیشت و تہذیب کی آبیاری کی۔ نٹشے (Nitche) نے اعلان کیا اگر اس کائنات کا کوئی خدا تھا تو اب وہ مر چکا ہے۔ گویا انسانیت شرک و دہریت دو انتہاؤں کے درمیان جھول رہی ہے اور اس نے ایک ایسے

ظلم کو رواج دیا ہے جس کے بوجھ تلے انسانیت کراہ رہی ہے۔

اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے توحید خالص کا تصور پیش کیا۔ خدا کو مرئی اور طبعی وجود سے مبرا ایک الٰہی ہستی بتایا جس کی کوئی مثال نہیں دی جاسکتی اس لئے اس کی شبیہ بنانا ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا ایک ان دیکھے خدا کا تصور پیدا کیا۔ یہ محض تصور نہیں رہا بلکہ یہ عقیدہ بن گیا اور اس خدا کی عبادت اور اطاعت کا ایسا سلیقہ سکھایا گویا خدا ہر جگہ موجود ہے اور ہر معاملہ میں ہماری رہنمائی کررہا ہے۔ اس لئے اسلامی توحید محض ایک نظریہ نہیں بلکہ عملی تصور ہے۔ خدا کا خوف اس سے محبت، اس کی اطاعت، اس کی رضاجوئی اس کی دید کا شوق، اس کے وعدوں پر یقین، اس کی جنت کی طلب اس کی جہنم سے نجات کی خواہش ہر مومن کے دل کی تمنا ہوتی ہے۔ مومن کا دل خدا کے خوف اور اس کے محبت سے معمور ہوتا ہے یہاں تک کہ تنہائی میں جب کوئی اس کو دیکھنے والا نہیں ہوتا محض خدا کے خوف سے اس کی آنکھیں نم ہوجاتی ہیں۔ آج دنیا کا ہر قانون پولس عدالت اور سماجی ضابطہ ایک انسان کو جرم کرنے اور گناہ کرنے سے باز نہیں رکھ پاتا ہے۔ غریب اور جاہل سماج تو دور، مہذب، دولت مند اور ترقی یافتہ سماجوں میں آج جتنی برائیاں اور ظلم رائج ہیں ان کا تصور بھی محال ہے۔ دولت علم، سائنسی ایجادات، پولس، عدالت، تفتیش کے جدید آلات و ادارے یہ سب جرم و گناہ کے بڑھتے سیلاب ظلم و زیادتی کے بڑھتے وبائی امراض کو روک پانے میں ناکام ہیں لیکن ایک دل جس میں خدا کا خوف جاگزیں ہے تمام تر آزادی، مواقع اور ترغیبات کے باوجود محض خدا کے خوف سے ان تمام گناہوں اور ظلم سے اپنے آپ کو روک رکھتا ہے۔ اس طرح اسلام کا تصور توحید محض ایک نظریہ نہیں بلکہ Functional proposition ہے۔

یہاں چھوٹی سے چھوٹی چیز یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا سے طلب کی جاتی ہے اور بڑی سے بڑی چیز یعنی شکست و فتح، رزق و خوشحالی اور زندگی اور موت کو اسی کے دست قدرت میں مانا جاتا ہے۔ اس لئے مسلمان سماج کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو انشاء اللہ کہتا ہے۔ کوئی کام پورا ہوجاتا ہے تو سبحان اللہ کہتا ہے۔ کسی خوبی کا اعتراف کرتا ہوتا ہے تو ماشاء اللہ کہتا ہے غرض خدا کا ذکر سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے، ہر وقت ہر آن، ہر موقع اور ہر کام میں ہوتا ہے گویا خدا وہ عامل ہے جس کے ذریعہ ہی سب کام ہوتے ہیں اور اس کے ذریعہ سب کام ہوں گے۔

آخرت: تصور توحید کے ساتھ ساتھ اسلام کا دوسرا سب سے جاندار تصور تصور آخرت ہے یعنی یہ کائنات اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ ایک دن اپنی حیات طبعی پوری کرنے کے بعد ختم ہوجائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ دوبارہ تمام انسانوں کو زندہ کرے گا اور ان کے عقیدہ اور ہر چھوٹے بڑے عمل کا حساب لے گا۔ جو لوگ خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ہوجائیں گے ان کے لئے خدا کی رضا اور دائمی قیام کی جگہ جنت اپنی تمام تر نعمتوں کے ساتھ ہوگی اور جو خدا کے فیصلہ میں ناکام ہوں گے انہیں خدا کے غضب اور اس کے سزا کے گھر جہنم میں جھونک دیا جائے گا جو بدترین جائے قرار ہے۔

یہ عقیدہ تین باتوں پر دلالت کرتا ہے۔ (۱) انسان اس کائنات میں شتر بے مہار نہیں ہے بلکہ اسے پلٹ کر اپنے رب کے حضور جانا ہے اور اپنے کئے کا حساب دینا ہے (۲) انسان مر کے مٹی نہیں ہوجائے گا بلکہ دوبارہ اسے زندہ کیا جائے گا اور اس سے حساب لیا جائے گا (۳) انسان نہ تو بار بار پیدا ہوگا اور نہ بار بار مرے گا۔ اسے ایک

بار زندگی ملی ہے اس کے بعد اسے موت آ گے گی۔ قیامت کے روز اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور حساب کتاب کے بعد اپنے اعمال کے بدلے اپنے انجام کے گھر پہنچا دیا جائے گا جہاں اسے حیات ابدی عطا کیا جائے گا۔ لہذا اس دنیا میں اصل چیز جو قابل اہمیت ہے نہ تو انسان کا حسب ونسب ہے نہ رنگ روپ، نہ مال ودولت، نہ صحت و تندرستی، نہ علم واقتدار بلکہ اصل چیز جو وزن رکھتی ہے وہ ہے انسان کا عقیدہ اور اس کا عمل۔ انسان کا عقیدہ اگر درست ہے اور عمل صالح ہے تو پھر اس کے لئے کوئی رنج اور خوف کا موقع نہیں ہے ورنہ اس کو خسارا اور تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

اس لحاظ سے عقیدہ آخرت انسان کو ایک ذمہ دار وجود قرار دیتا ہے اور اسے اعمال اور عقیدے کے باب میں حساس اور باشعور رہنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ نفس کی خواہشات، برے لوگوں کے اثرات اور شیطان کی ریشہ دوانیاں اس کے عقیدے اور عمل کو پراگندہ نہ کردیں اور وہ تباہی سے ہم کنار نہ ہو جائے۔

عقیدہ رسالت : لہذا اللہ نے اس کو محض انسان کے عقل سلیم پر نہیں چھوڑ دیا کہ وہ اپنے لئے سیدھی راہ دریافت کرلے۔ حالانکہ انسان کی فطرت میں فجور و تقویٰ دونوں الہام کئے گئے ہیں نیز اس کے اندر نفس امارہ کے ساتھ ساتھ نفس لوامہ بھی موجود ہے اس کو حواس خمسہ یعنی آنکھ، کان، ناک، منہ دئے گئے اور ایک سوچنے سمجھنے والا دماغ عطا کیا گیا تاہم ہدایت کے لئے اتنا کافی نہیں تھا اس لئے انسانوں کو خدا کی مرضی بتانے اور اسے زندگی کی سیدھی سچی راہ دکھانے اور اس پر چلانے کے لئے خدا نے رسول بھیجے اور کتاب نازل کی۔ یہ رسول ہر زمانے، ہر قوم اور ہر زبان میں آئے اور یہ اپنے ساتھ پاکیزہ تعلیمات اور اخلاقیات بھی لائے نیز زندگی گذارنے کے لئے اصول

وضوابط جس کو شریعت کہا جاتا ہے لائے۔ ان کی تعداد لاکھوں میں جاتی ہے جب سے دنیا قائم ہے اور انسانی آبادی پائی جاتی ہے رسول آتے رہے اور انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کرتے رہے یہاں تک کہ انسانیت جب اپنے سن بلوغ کو پہنچ گئی تو اللہ نے اپنا آخری نبی اور اپنی آخری کتاب بھیجی۔ اللہ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اللہ کی آخری کتاب قرآن پاک ہے۔ یہ مکمل دین اور مکمل شریعت ہے جس پر اللہ کی پسند کی مہر لگی ہوئی ہے اور یہ انتباہ بھی کہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے باقی تمام ادیان باطل ہیں اس لئے کوئی اس دین کو چھوڑ کر اگر دوسرا دین قبول کرے تو وہ ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا۔ وہ خدا کے حضور باغی اور گناہ گار قرار دیا جائے گا۔ جس کی سزا جہنم ہے۔ اس لئے پوری انسانیت کو اللہ کا کنبہ قرار دیتے ہوئے سب کی خیر خواہی اور بھلائی کے لحاظ سے سب کو اس بات کی دعوت دی گئی کہ وہ اس دین کو قبول کرے۔ مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اس دین کے بارے میں بتائیں اور ان کو اس کو قبول کرنے کی دعوت دیں لیکن اس کے لئے جبر واکراہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ تم پر محض اس کو پہنچانے کی ذمہ داری ہے زبردستی منوالینا تمہارا کام نہیں ہے۔ یہ ایک نعمت ہے جس کا جی چاہے قبول کرے اور جس کا جی نہ چاہے اسے قبول نہ کرے۔ مگر نہ قبول کرنے کی صورت میں وہ خدا کے حضور ناکام ونامراد ہوگا۔ اور وہاں مجرموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ نہ تو کسی کی سفارش کام آئے گی اور نہ کوئی فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ ہی دوبارہ اسے دنیا میں اپنی بھول سدھارنے کے لئے بھیجا جائے گا۔ اس لئے فیصلہ اسے آج اور ابھی اسی حیات میں کرنا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مدت حیات بڑی قیمتی اور دوررس نتائج کی حامل ہے۔ اس کا لمحہ لمحہ قیمتی ہے۔ جس کو

پوری ذمہ داری اور احساس جوابدہی کے ساتھ گذارنا ہے۔ ورنہ جو وقت گذر گیا وہ کسی طرح واپس نہیں لایا جاسکتا۔ لہذا مسلمانوں کو اپنی شخصی، ملی اور عالمی ذمہ داری اسی مدت حیات میں پوری کرنی ہے اس لئے کہ ان پر دوہری ذمہ داری ہے۔ ایک خود کو دین پر قائم رکھنے کی اور دوسرے دنیا کو اس کی دعوت دینے کی۔ وہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں کمزور ہوں یا مضبوط دولت مند ہوں یا غریب، مسافر ہوں یا مقامی، عورت ہوں یا مرد ہر کسی کو ہر حال میں یہ فریضہ انجام دینا ہے۔ اسی لئے وہ خیر امت قرار دئے جاتے ہیں اگر انہوں نے یہ فریضہ انجام نہیں دیا تو خیر امت کے منصب سے معزول کردئے جائیں گے اور ذلت و نکبت انکا مقدر بن جائے گی۔ پھر ان کی تعداد، ان کا علم نہ ان کی دولت و جمعیت ان کو وہ مقام نہیں دلاسکتی ہے اور نہ اللہ کے آخری فیصلہ میں یہ کامیاب ہوسکتے ہیں۔

اس پس منظر (Backdrop) میں اگر آپ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کا جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ ملت اسلام بے سمت و مقام کی ایسی وادی میں گم ہوگئی ہے جہاں انہیں کچھ بھی خبر نہیں کہ وہ کون ہیں اور ان کی ذمہ داری کیا ہے۔ ان کے عقائد و اعمال اتنے پراگندہ ہوچکے ہیں کہ اب بت پرست اور دہریہ بھی ان پر طعنہ زن ہیں۔

توحید کا ایک دھندھلا تصور ہے جس میں عملیت اور توانائی تو دور اس کی عصمت بھی مجروح ہورہی ہے۔ جاہلیت نے بھیس بدل کر نئے اصنام تراش لئے ہیں۔ مسلمانوں میں دینی جہالت اتنی عام ہے اور چند سکوں کے عوض آیات ربانی کا سودا کرنے والے اتنے ہیں کہ وہ توحید کے جام میں شرک کی شراب اس ہوشیاری کے ساتھ لوگوں کو پلارہے ہیں کہ انہیں احساس بھی نہیں ہوتا اور ان کی متاع دین و دانش

لٹتی چلی جاتی ہے۔ اسلام میں کوئی احبار و رہبان نہیں ہے کوئی پوپ اور برہمن نہیں ہے خدا اور بندے کے درمیان سیدھا اور بلاواسطہ رشتہ ہے۔ تم اپنے رب کو پکارو اپنے دین کو خالص کر کے۔ وہ تمہاری پکار سنتا اور جواب دیتا ہے وہ تو تمہارے شہہ رگ سے بھی قریب ہے۔ تم خواہ چھپاؤ اور ظاہر کرو وہ تمہارے دلوں کے راز سے بھی واقف ہے۔ لہذا خدا کے حضور اس طرح کھڑے ہو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو یا کم از کم خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔ بندہ اپنے خدا سے سب سے قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے خدا اس کی سرگوشیاں سنتا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے علم اور گرفت میں ہے۔ اللہ سے قرب کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ وہ خوف انابت اور تقویٰ ہے۔ اللہ کے ایسے ہزاروں لاکھوں برگزیدہ بندے ہیں جنہوں نے اپنے رب کی اخلاص کے ساتھ عبادت کی اور اللہ نے انہیں خلق کی نگاہ میں مقبول و محترم بنادیا۔ مگر دنیا کا کوئی شخص خواہ وہ کتنا بڑا بزرگ ہو رسول سے بڑا نہیں ہوسکتا۔ اور جب رسول کا الوہیت میں کوئی حصہ نہیں ہے تو پھر کسی اور شخص کا حصہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جس رسول کی تعلیم یہ ہے کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو خدا سے مانگو۔ وہ دین کیسے گوارہ کرسکتا ہے کہ کسی اور شخص کے آستانے پر سر رکھ کر، ہاتھ پھیلا کر اس سے کچھ مانگا جائے انسان کی معراج یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ رہے۔ بندوں کا خدا نہ بنے۔ جو لوگ یہ جسارت کرتے ہیں یا جو لوگ کسی کی جانب اس طرح کا انتساب کرتے ہیں وہ صریح جہل اور ظلم میں مبتلا ہیں۔ بزرگوں کا احترام کرنا۔ ان سے عقیدت رکھنا ان کے حق میں کلمہ خیر کہنا ان کے لئے اللہ سے دعاء کرنا۔ ان جیسی زندگی طلب کرنا۔ ان کے نقش قدم پر چلنا یہ سب محمود اور پسندیدہ ہی نہیں بلکہ ضروری ہیں کیونکہ اسی طرح

چراغ سے چراغ روشن ہوتے ہیں اور ہدایت کا نور پھیلتا ہے۔ لیکن ان کے مرقد کو معبد بنالینا۔ ان کی عقیدت میں غلو کرنا ان کو خدائی میں شریک بنانا یا زور آور تصور کرنا یہ محض جہالت ہے۔ قرآن وسنت سے ایسے کسی عقیدے کی تصدیق نہیں ہوتی۔ لیکن آج ملت اسلامیہ کا ایک بڑا طبقہ اس جہالت میں گرفتار عصمت توحید کو داغدار کر رہا ہے۔ جو گروہ خدا کی عصمت کا احترام نہیں کرے گا کیا اس کی عصمت کی حفاظت ہو سکے گی؟

اللہ نے بعض مقامات اور اس کے ماحول کو برکت دی ہے جہاں عبادت کرنا، دعاء کرنا ثواب اور قبولیت دعاء دونوں کے لحاظ سے محمود ہے۔ اس میں بیت الحرام، مسجد نبوی اور بیت المقدس کا ذکر تو حدیث پاک میں آتا ہے لہذا زیارت کے لئے انہیں تینوں مقامات کے سفر کی ترغیب دی گئی ہے گھر کے مقابلے مسجد کے ماحول کو زیادہ پاکیزگی اور برکت والی جگہ مانا گیا ہے کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں ہر وقت اللہ کا ذکر ہوتا ہے اور لوگ خالص عبادت کی غرض سے اس مقام پر آتے ہیں۔ اس لئے گھر میں نماز پڑھنے کے مقابلہ مسجد میں نماز پڑھنے کا زیادہ ثواب بتایا گیا ہے۔ یقیناً گھر میں دعاء کرنے کے بجائے مسجد میں دعا کرنا قبولیت کے امکان کو بڑھادیتا ہے۔ جن مقامات پر خلق اللہ کو خوش عقیدگی ہے کہ وہ مقامات قبولیت دعاء کی وجہ سے مرجع خلائق ہیں تو ایسے کسی مقام پر جاکر دعاء کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن کسی بزرگ کے بارے میں کوئی ایسی رائے رکھنا جس سے اللہ سبحانہ تعالی کے اختیار و عظمت میں کمی کا اندیشہ ہو تو اس سے حد درجہ بچنا چاہئے۔ یہاں میں جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی باور کراتا چلوں کہ ہر مذہب کے ماننے والے لوگوں نے بعض مقامات اور شخصیتوں کو محترم اور مقدس مانا ہے اور وہاں جاکر ان سے براہ راست دعا کرتے ہیں اور لاکھوں لوگوں کی

آرزوئیں وہاں پوری ہوتی ہیں تبھی تو ان کی عقیدت قائم ہے اور اس نے شرک کا ایک زبردست دروازہ کھول رکھا ہے بلکہ ان تمام مقامات پر کھلا شرک ہوتا ہے اصنام پرستی ہوتی ہے، ان کی پوجا ہوتی ہے، لوگ ماتھا ٹیکتے ہیں یعنی سجدہ ریز ہوتے ہیں، قربانیاں کرتے ہیں منتیں مانتے اور چڑھاتے ہیں۔ تو کیا ان سب کو صحیح مان لیا جائے یا کھلا شرک ہونے کی وجہ سے ان کو غلط قرار دیا جائے کہ یقیناً یہ کھلا شرک ہے اس لئے غلط ہے۔ پھر وہاں لوگوں کی دعائیں کیسے قبول ہوتی ہیں اور ان کی منتیں کیسے پوری ہوتی ہیں؟ یہ محض خوش عقیدگی ہے۔ جو لوگ دہریے ہیں، کسی خدا کے وجود کو نہیں مانتے کسی ٹونے ٹوٹکے میں یقین نہیں رکھتے۔ کسی آستانے پر سر نہیں جھکاتے کیا ان کی زندگی کی گاڑی نہیں چلتی ہے؟ بلکہ وہ زیادہ خوشحال، خوش باش ہوتے ہیں۔ آج سائنس نے بہت سے لاینحل مسئلہ کا حل ڈھونڈھ لیا ہے اور اس میں ایسی عمومیت عطا کی ہے کہ ہر جگہ اور ہر کسی کے لئے یکساں طور پر لائق استعمال اور مفید ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ان خرافات کو اوہام کے سوا کچھ اور قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لہذا لوگوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ نے اپنی سنت بنا رکھی ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی نظام کے تحت یہ سارا کارخانہ کائنات رواں دواں ہے۔ عقیدے کے صحیح اور غلط کا اندازہ قیامت میں ہوگا۔ دنیا میں ادیان باطل اور دین حق سب باقی رہیں گے اس لئے غلط لوگوں کی چلت پھرت اور ان کی چمک دمک سے کوئی غلط نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں اور حضورؐ نے اپنے اقوال واعمال کے ذریعہ عقیدے اور عبادت کے باب میں ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے جس سے ایک آدمی کو اشتباہ ہو اور وہ توحید اور اس کے تقاضے نہ سمجھ سکے۔ اسلام کا

امتیازاس کا عقیدۂ توحید ہے جو اسے تمام ادیان اور عقیدوں سے ممتاز اور ممیّز کرتا ہے۔ لہذا اس کی عصمت، ندرت اور حرمت کی حفاظت تمام مسلمان پر فرض ہے ورنہ اس امت کی عصمت و حرمت محفوظ نہیں رہ سکتی ہے۔

توحید کی طرح آخرت کا تصور بھی ہمارے ذہنوں میں دھندھلا ہے۔ ہم اس بات کو مانتے تو ہیں کہ ایک روز مرنا ہے اور اپنے رب کے حضور حساب کتاب دینا ہے۔ لیکن آخرت کم اور دنیا زیادہ ہوگئی ہے اس لئے ہم دنیا کے لئے زیادہ فکر مند، کوشاں اور دعا گو ہوتے ہیں اور آخرت کے لئے کم فکر مند کوشاں اور دعاء گو ہیں۔ اس ذہنیت نے ہمارا پورا مطمح نظر (orientation) ہی تبدیل کر دیا ہے۔ لہذا عقیدہ آخرت میں وہ مضبوطی اور گرمی باقی نہیں رہی جو ہمیں ان دیکھے خدا کے خوف اور آخرت میں برے انجام کے ڈر سے غلط باتوں سے باز رکھ سکے۔ ہم گناہ میں جری ہوگئے ہیں اور ہمارے اندر اپنے رب سے بغاوت کا داعیہ پیدا ہو گیا ہے۔ نتیجہ ہے کہ ملت کے عوام و خواص سے وہ جوہر اصلی نکل گیا ہے جس کی وجہ سے یہ صراط مستقیم پر گامزن تھے۔ ہم نے بھی بد عقیدہ قوموں کی طرح بہت سے باطل خیالات اپنے ذہنوں میں پال لئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کے آخری رسول کی امت ہیں جن کو اللہ نے برگزیدگی عطا کی ہے لہذا آپ کے کلمہ گو جہنم میں نہیں جائینگے۔ اور گئے تو آپ کی سفارش سے فوراً وہاں سے نکل آئینگے۔ ہم سے پہلے عیسیٰ اور موسیٰ علیہ السلام کی قوموں نے یہی خوش فہمی پالا تھا اور وہ گمرہی میں بہت دور نکل آئے۔ اللہ کی آیات کو توڑنا مڑورنا، تحریف کرنا، چند سکوں کے عوض بیچنا، اس سے لا پرواہی برتنا اور آزادانہ روی اختیار کرنا اور آخر میں سب کو حرف غلط سمجھ کر رد کر دینا یا مٹانے کے درپے ہونا یہ ساری حرکات یہ قومیں کر رہی

ہیں اور یہ ساری چیزیں ہمارے اندر بھی در آئی ہیں۔ حالانکہ اس باب میں بھی قرآن و حدیث کی تعلیمات اتنی صاف اور واضح ہیں کہ اس میں اشتباہ کی کہیں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن دینی جہالت کے عام ہونے اور دنیا پرست علماء کی ایک بڑی جماعت کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے یہ عقیدہ جو ایک مضبوط کھونٹے کی طرح تھا جس سے بندھا جانور اپنی رسی کی وسعت سے زیاد قلابازیاں نہیں کر سکتا تھا جس کو قرآن کی اصطلاح میں حدود اللہ کہتے ہیں لوگوں نے اس کھونٹے کو ہی اکھاڑ دیا ظاہر سی بات ہے اب یہ جانور چاہے جس کھیت میں منہ مارے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ خاص طور سے اگر یہ جانور دولت مند اور صاحب اقتدار ہو تو فتوے بھی اسی کی مرضی اور خواہش کے مطابق دئے جائیں گے۔ عوام جو یا تو جانور محض ہوتے ہیں یا بڑے لوگوں کے نقال وہ بد عقیدہ لوگوں کی چلت پھرت ان کی طاقت و ثروت سے مرعوب و متاثر ہو کر انہی کی طرح کے اعمال و اخلاق اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی عقیدے آخرت کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر پیش کیا جائے اور اسے ذہنوں میں اتارنے کی کوشش کی جائے تاکہ یہ ایک زندہ اور توانا عقیدے کی شکل میں لوگوں کے رگ و پے میں سما جائے۔ جب تک اس انداز کی تعلیم و تربیت کا نظم نہیں کیا جائے گا امت اپنے محور پر واپس نہیں آسکتی۔ پھر مسلمان تمام تر ترقیات کے باوجود ایک دوسری قوم ہوں گے امت مسلمہ نہیں رہینگے۔

رسول پر ایمان اسلامی عقیدے میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ رسول ہی ہے جس کے ذریعہ اللہ کے احکامات اور ہدایتیں ہم تک پہنچی ہیں اس لئے رسول پر ایمان اللہ پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے کیونکہ یہ اطاعت

اللہ کے اذن سے ہے۔ رسول کو اللہ نے صرف پیغامبر ہی نہیں بنایا بلکہ اسے ہادی اور رہنما بنایا اور رسول کی زندگی کو ہمارے لئے نمونہ بنایا اور ہمیں اس کی مکمل پیروی کی تعلیم دی رسول جو دیں اس کو لے لو اور رسول جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔ رسول کو اللہ نے ہر طرح کے خطا اور نسیان سے پاک رکھا ہے۔ اس لئے اس کی پوری زندگی اور اس کا ہر عمل ہمارے لئے لائق اتباع ہے الا یہ کہ جس معاملے میں اللہ نے اور خود حضورؐ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا ہو۔

مسلمانوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ دنیا میں کسی بھی مذہبی رہنما سے کہیں زیادہ حضور پاکؐ کا احترام کرتے ہیں مسلمانوں کی یہی وہ خوبی ہے جس نے آج تک اس ملت کو گمراہ ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ ورنہ حضور کی ذات کے خلاف آپ کے معاندین نے جیسی جیسی ریشہ دوانیاں اور بد تمیزیاں کیں ہیں اگر مسلمان اس معاملے میں ذرا سی ڈھیل دیں یا کمزوری دکھائیں تو پروپگنڈے کا سیلاب ان کو اتنی دور بہالے جائے گا کہ یہ پتہ ہی نہیں چل پائے گا کہ وہ کہاں تھے اور کہاں آرہے ہیں۔ لیکن دشمنان دین نے پے در پے حملوں کے ذریعہ آپ کے اطاعت کا دائرہ اور سنتوں کا اہتمام محدود کر دیا ہے اور سوائے چند روایتی اور رسمی علامات محبت کے باقی زندگی اور اس کے معاملات آپ کی براہ راست نگرانی اور رہنمائی سے خالی ہو گئے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ مسلمان اپنے تمام نجی اور اجتماعی معاملے کا فیصلہ حضورؐ کے دربار سے کرواتے تھے اور اس پر بے چوں وچرا عمل کرتے تھے اب دوسرا وقت یہ ہے کہ میٹھا کھانے اور خوشبو لگانے کی سنتوں کے علاوہ آپ کی زندگی جو سراپا ہدایت اور نمونہ تھی دیگر امور میں مثلاً شادی بیاہ، تجارت، لین دین، صلح وجنگ وغیرہ میں آپ کی طرف رجوع کرنے کا خیال بھی نہیں گذرتا۔

ہم نے رسول کی ذات کو آپ کی دعوت کو آپ کی سنتوں کو محدود کر دیا ہے حالانکہ حضور رحمت اللعالمین ہیں اور ساری دنیا کی طرف اللہ کے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور ساری انسانیت کے لئے آپ کی ذات رحمت وہدایت کا واحد ذریعہ ہے۔ لیکن جب مسلمانوں نے آپ کو اس حیثیت سے تسلیم نہیں کیا ہے تو کسی غیر مسلم کو وہ کس طرح آپ کی ذات کا ایسا تعارف کرا سکتے ہیں۔ لہذا آپ کے احترام کے چند روایتی علامتوں سے اوپر اٹھ کر آپؐ کی پوری زندگی کو اپنے لئے نمونہ عمل بنانے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ حضور پاکؐ کی دو حدیثیں اس باب میں ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک میں تم کو تمہارے ماں باپ، بیوی بچوں یہاں تک تمہاری اپنی ذات سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں" (غالباً آپ نے ایسا ہی فرمایا)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک تمہاری خواہش نفس اس بات کو مان نہ لے جسے میں لے کر آیا ہوں"

لہذا آپ سے محبت بھی مکمل ہونی چاہئے اور آپ کی اطاعت بھی مکمل ہونی چاہئے تبھی ہم مومن ہو سکتے ہیں۔ ورنہ محض یہ ایک نام ہے جو ہمارے باپ دادا نے رکھ رکھا ہے جس کی کوئی دینی اہمیت نہیں ہے۔

جس کسی قوم میں بد عقیدگی آتی ہے تو کہاں کہاں اور کس کس شکل میں ہوتی ہے اس کا احاطہ مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے حضورؐ کی اطاعت تو کب کا چھوڑ دیا لیکن آپ کی ذات کو ہی معرض بحث بنا دیا اور اس اس باب میں افراط و تفریط کی ایسی مثال

پیش کی ہے جو کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ ایک طرف لوگوں نے رسول کی ذات کو اتنا بڑھایا اتنا بڑھایا کہ اس کو خدائی کے مقام تک پہنچا دیا بلکہ بسا اوقات خدا سے بھی زیادہ کر دیا۔ اس خیال کے باطل ہونے میں کسی کو کوئی شبہہ نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری طرف لوگوں نے عصمت توحید کی حفاظت میں اتنا غلو برتا کہ حضورؐ کی شان میں گستاخی کا شبہہ ہونے لگتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان سیدھی سچی راہ یہ ہے کہ اللہ نے قرآن پاک میں اپنے رسول کا جس انداز اور جن الفاظ میں ذکر کیا ہے اور خود حضورؐ نے اپنے بارے میں جو ہدایات دیں ہیں ان کو اپنی طرف سے کوئی معنی پہنائے بغیر لفظاً لفظاً تسلیم کر لیا جائے اور اس سے زیادہ نہ ایک لفظ کہا جائے اور نہ اس میں ایک لفظ کی کمی کی جائے۔ اگر ہم قرآن و سنت کی صحیح پاسداری کریں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور امت ایک بڑے فتنے اور اختلاف سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ رہا عقیدت تو یہ شخصی جذبہ ہے جس کو عقیدے کی لگام کے ذریعہ حد اعتدال میں رکھنا چاہئے۔ ہر دو صورت میں زبان و قلم پر سخت پہرہ بٹھانے کی ضرورت ہے۔

بہر حال جب تک امت حضورؐ کو اپنا مرجع تسلیم نہیں کرتی اور آپ کی ہدایات کا التزام نہیں کرتی۔ اس وقت تک اس کو دنیا کی کوئی طاقت دنیا و آخرت میں کامیابی سے ہم کنار نہیں کر سکتی۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے ایک ہی نسخہ کیمیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی ذات کو جانیں آپ کی تعلیمات کو سمجھیں۔ آپ کا احترام کریں اور آپ کی زندگی کے جملہ معاملات میں اطاعت بجالائیں پھر ان کا مقدر سنور جائے گا اور وہ ایک ہی جست میں ذلت سے عزت کی وادی میں پہنچ جائیں گے۔ اس کے لئے مسلمانوں میں آپ کی ذات کا تعارف اور آپ کی سنتوں کی بڑے پیمانے پر اشاعت و تعلیم ضروری

ہے۔ میلاد کی محفلوں، سیرت کے جلسوں، جمعہ، عیدین اور دیگر اجتماعی مواقع کو اس کام کے لئے بڑے پیمانے پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن پاک اللہ کی آخری کتاب ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ یہ کتاب ہدایت ہے۔ اس میں برکت ہے۔ شفاعت ہے، ثواب ہے۔ یہ کتاب مقدس ہے۔ مسلمانوں پر اس کتاب کا پڑھنا، سمجھنا، اس پر عمل کرنا اور دوسروں کو اس کتاب کی تعلیمات سے روشناس کرانا واجب ہے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اس کتاب کو خود پڑھے اور اپنے بچوں کو پڑھائے۔ ایک مسلمان گھر کی پہچان یہ ہے کہ اس گھر سے تلاوت کلام پاک کی آواز بلند ہو۔ یہ وہ نغمہ سرمدی ہے جو کسی مسلمان کے روح کی غذا ہے۔ تمام مسلمان پر اس کتاب کا احترام واجب ہے۔ اس کتاب کو پاک صاف ہو کر ہی چھونا اور پڑھنا چاہئے بلکہ تلاوت کلام پاک سے پہلے باوضو ہونا چاہئے۔ تیسرے یہ کہ آدمی قبلہ رو ہو کر پڑھے، اس کتاب کو توجہ اور شوق سے پڑھے۔ اس کی صحیح صحیح تلاوت کا التزام کرے۔ اگر اچھی آواز ہو تو با آواز بلند پڑھے تاکہ لوگوں کو سننے میں اچھا لگے۔ قرآن پاک کا احترام یہ ہے کہ جب کلام پاک کی تلاوت ہو رہی ہو تو خاموش رہیں اور توجہ سے سنیں۔ قرآن پاک کو سمجھ کر پڑھنا اور اس کے کچھ حصوں کو یاد کر لینا ضروری ہے تاکہ نماز میں آسانی ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ تمام فرض اور نفل نمازوں میں قرآن پاک کا کچھ حصہ پڑھنا واجب ہے۔

قرآن پاک صرف کتاب مقدس ہی نہیں ہے بلکہ اصلاً یہ کتاب ہدایت ہے جس کو اللہ نے تمام دنیا والوں کو اپنی پسند کی سیدھی سچی راہ دکھانے کے لئے نازل کیا ہے اس لئے آج اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ اللہ نے کیا پسند کیا ہے اور کیا ناپسند کیا

ہے اس کے نزدیک کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے یہ وہ کس عقیدے اور عمل کو صحیح قرار دیتا ہے اور کس عقیدے اور عمل کو غلط۔ انسانوں کی کامیابی کن کن امور میں ہیں اور اس کی ہلاکت کو کون سی چیزیں مستوجب کرتی ہیں۔ دنیا میں کون سی قومیں خدا کے غضب کا شکار ہوئیں اور کیوں ؟ اور کون لوگ فلاح یافتہ رہے ہیں۔ قیامت میں کون کامیاب ہوں گے اور کون ناکام۔ سیاست، تجارت، معیشت، معاشرت، اخلاق، صلح وجنگ، ہدایت وضلالت، رحم وشقاوت۔ خاندانی اور ملکی نظام بین الاقوامی تعلقات وغیرہ کی کون سی صحیح بنیادیں ہیں جن کو اللہ نے پسند فرمایا ہے تو اس کے لئے واحد مستند ذریعہ صرف قران پاک ہے۔

بندہ اپنے رب سے صراط مستقیم پر چلنے اور چلانے کی دعاء مانگتا ہے اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اس کے سامنے پورا قرآن پیش کر دیتا ہے اور اس کو ہدایت کرتا ہے کہ قرآن کی راہ ہی سیدھی راہ ہے جس کی طلب تم نے کی ہے لہذا بے کھٹکے اس کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن ہو جاؤ۔ یہ راہ تمہارے منزل مقصود یعنی اللہ کی رضاء اور اس کے دیدار اور اس کی نعمتوں بھری جنت تک پہنچادے گی اور دنیا میں انہیں ایک پاکیزہ زندگی گذارنے کا سلیقہ عطا کرے گی۔

قرآن دنیا کی سب سے انقلابی کتاب ہے جس نے اپنے نزول کے وقت ایک سوئی ہوئی قوم میں زندگی کی وہ رمق جگائی جس سے وہ قوم دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئی۔ پچھلے پندرہ سو سالوں میں اس نے نہ معلوم کتنی قوموں اور افراد کی زندگیوں میں انقلاب برپا کیا ہے اور آج بھی یہ اپنے اندر انقلاب کے وہ تمام عوامل رکھتی ہے۔

قرآن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ پڑھنے اور یاد کرنے میں آسان ہے۔

دوسرے اسکی تعلیمات بہت واضح ہیں جس میں کوئی اشتباہ اور ٹیرھ نہیں ہے اس پر عمل کرنا بھی آسان ہے۔

قرآن کے من جانب اللہ ہونے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ یہ نبی امی پر نازل ہوا ہے اور خود نبی پاک نے اس کو من جانب اللہ ہونے کی سند دی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب ہر تحریف سے پاک ہے۔ ایک شوشہ اور ایک نقطہ کا بھی فرق نہیں آیا ہے۔ آج اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی ایک ایک خامی اور کمزوری کو بڑھا چڑھا کر طشت ازبام کرنے پر لگے ہوئے ہیں لیکن اسلام کا کٹر سے کٹر مخالف بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرات نہیں کرسکتا کہ قرآن پاک میں ایک لفظ کی بھی تحریف ہوئی ہے۔ یہ کتاب حضور سے جیسے اور جس شکل میں ملی ہے اسی شکل میں آج تک امت میں پائی جاتی ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ اللہ نے خود اعلان کیا ہے ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں آثار قیامت میں جہاں بہت ساری باتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہیں یہ بات بھی درج ہے کہ قیامت تبھی آئے گی جب قرآن پاک کے الفاظ اٹھا لئے جائینگے۔ اس اعتبار سے قرآن دنیا کی پہلی اور آخری مذہبی کتاب ہے جو ہر تحریف اور تبدیلی سے پاک ہے۔ یہ دعویٰ نہ توریت کا ہے نہ انجیل کا اور نہ ہی دنیا کی کسی اور مذہبی کتاب کا۔ لہذا مسلمانوں کے پاس ایک اللہ کے رسول کی ذات ہے اور دوسرا قرآن پاک ہے جس کا جب تک احترام باقی رہے گا امت کبھی گمراہ نہیں ہوگی۔ اگر اس احترام کے ساتھ ساتھ اس کی اطاعت کا داعیہ پیدا ہو جائے تو دیکھتے دیکھتے ایک انقلاب عظیم رونما ہوگا اور امت کو غالب ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

لیکن جس طرح مسلمانوں نے توحید میں شرک کی آمیزش کردی ہے۔ آخرت کے عقیدے میں جھول پیدا ہوگیا۔ رسالت کا عقیدہ بھی علم کلام کی بحث میں کچھ کا کچھ ہوگیا اسی طرح قرآن پاک کے ساتھ بھی مسلمانوں کا برتاؤ اچھا نہیں ہے۔ ابھی کل تک مسلمان کم از کم قرآن پاک کی تلاوت کو ضروری سمجھتے تھے۔ بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھانے کا التزام کیا جاتا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے اب اس میں بھی کمی آرہی ہے۔ پڑھے لکھے نو دولت مند گھرانوں سے تو گویا قرآن پاک رخصت ہی ہوگیا ہے۔ اسے سمجھنا تو دور لوگوں کو تلاوت کلام پاک تک کی فرصت نہیں ہے۔ ایسے لوگ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں ہیں جنہوں نے سال میں کبھی ایک بار بھی قرآن پاک کھول کر نہیں پڑھا۔ یہ ان لوگوں کا حال ہے جو پڑھے لکھے ہیں اور جن کو بچپن میں ان کے والدین نے قرآن پاک پڑھوایا تھا۔ رہے وہ لوگ جو جاہل ہیں ان کی بات الگ ہے۔ آج جبکہ کنونٹ تعلیم کا زور ہے اب بچپن میں بہت سے گارجین بچوں کو قرآن پاک پڑھوانا ضروری نہیں سمجھتے۔ ظاہر سی بات ہے یہ بچے جب پڑھ لکھ کر بڑے ہوں گے تو یہ کیسے مسلمان بنیں گے اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آج کل مسلمان بچوں کی بڑی تعداد ڈی اے وی اور ودیہ مندر جیسے اداروں میں تعلیم حاصل کررہی ہے جہاں کھلے شرک کی تعلیم دی جاتی ہے جو بچوں کے ذہن سے کھرچ کھرچ کر توحید، رسالت، آخرت اور قرآن کی عظمت جیسے عوامل کو نکال رہے ہیں تاکہ انہیں ہندو تہذیب و معاشرت میں ضم کردیا جائے۔ لہذا یہ مستقبل کے بڑے خطرات میں سے ایک ہے جس پر پوری سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

کل تک شاعر یہ مرثیہ پڑھتا تھا کہ قرآن پاک کو دیبا اور ریشم کے جزدانوں

میں بند کر کے کسی اونچے طاق پر رکھ دیا جاتا ہے اور تعویز بنا کر اس کو گلے اور بازو کی زینت بنایا جاتا ہے۔ یا بیماری کی حالت میں پانی پھونک کر دینے کے کام آتا ہے۔ لیکن قرآن پاک سے یہ بے تعلقی اگر اسی طرح باقی رہا تو اس کا یہ احترام بھی دلوں سے جاتا رہے گا اور شاید اسی طرح قیامت آجائیگی۔

میں نے بڑے پڑھے لکھے اور دولت مند صاحب رتبہ گھرانوں میں دیکھا ہے کہ جب لڑکی رخصت ہو رہی ہوتی ہے تو اسے قرآن پاک کے نیچے سے گزارا جاتا ہے اور جب وہ کار میں بیٹھ جاتی ہے تو قرآن کے اوراق سے ہوا دی جاتی ہے اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے احترام اور اس سے حاصل برکت کا مقصد پورا ہوگیا کیا قرآن اسی لئے نازل ہوا ہے؟ پھر ان اعمال کی سند کیا ہے؟ کیا قرآن و سنت میں ایسے کسی عمل کی گنجائش ہے؟ ہمیں اس پر ضرور سوچنا چاہئے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ایسی جماعتیں اور افراد ہیں جو مسلمانوں کو قرآن پاک سمجھ کر پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایسا کرنا گمراہی ہے۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ قرآن پاک محض ثواب اور برکت کے لئے ہے اس لئے اگر ہم اپنا وقت ترجمہ اور تشریح میں لگائیں تو اس سے ثواب میں کمی آجائے گی۔

لہذا وہ نہ صرف جاہل اور کم پڑھے لکھے عوام کو بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں یہاں تک کہ طلباء اور نوجوانوں کو بھی قرآن پاک سمجھ کر پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مذہب کی رو سے کسی عمل کا ثواب محض اس کی ادائیگی پر ہی نہیں بلکہ اس کی سمجھ داری پر منحصر کرتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ جس کے حق میں بھلائی کا فیصلہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کردیتا ہے'' خود قرآن

پاک میں قرآن کو سمجھ کر پڑھنے اور اس پر غور کرنے کی بار بار تاکید آئی ہے۔ لہذا ان تمام نصوص اور آثار کو ترک کر کے محض طوطے کی طرح قرآن کو پڑھنا اور رٹنا چاہے جتنے ثواب کا باعث ہو لیکن اس سے تلاوت کا حق ادا نہیں ہوگا۔

ایک بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن پاک دنیا کے تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے اور یہ قیامت تک جتنے انسان پیدا ہوں گے تمام انسانوں کے لئے واحد رہنما کتاب ہے۔ اب دنیا میں تمام لوگوں کی زبان عربی نہیں ہے اس لئے وہ اگر قرآن پاک کو جاننا اور سمجھنا چاہیں تو وہ کیسے جانے اور سمجھیں گے ؟ لہذا ایسے تمام لوگ جن کی زبان عربی نہیں ہے اور وہ ناظرہ کے علاوہ قرآن پاک کے احکامات وہدایات سے واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ ان کی اپنی زبان میں اس کا ترجمہ اور اس کی تشریح پیش کی جائے تاکہ وہ اس کو اچھی طرح جان اور سمجھ سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے علمائے کرام نے دنیا کی سینکڑوں زبانوں میں قرآن پاک کا ترجمہ اور اس کی تفسیر پیش کی ہے تاکہ یہ کتاب تمام زبان والوں کو سمجھ میں آسکے۔ جو لوگ اتنی سیدھی سادی حقیقت کو نہیں سمجھتے ان کو تبلیغ دین کا کیا حق ہے ؟ اور ان کی تبلیغ سے گمراہی ہی پھیلے گی ؟

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کے بارے میں مسلمانوں کا نظریہ بدلے۔ مسلمان اسکو کتاب ہدایت سمجھ کر تلاوت کریں۔ اس کی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ دوسروں کو قرآن پاک کی تعلیم دینے کے لئے حلقہ قائم کریں اور اس کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کا اہتمام کریں۔ تبھی امت

گمراہی سے ہدایت کی طرف، کفر سے اسلام کی طرف، نفاق سے اخلاص کی طرف اور جہالت سے علم کی طرف آسکتی ہے جو امت کی اصلاح وترقی کی شاہ کلید ہے۔

لہذا اگر موجودہ مسلمان ملت کی زبوں حالی پر ایمانی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو شاید ہماری بدعقیدگی اور عقیدے کے معاملے میں ہماری سہل انگاری بلکہ جہالت ہماری زبوں حالی کی بنیادی وجہ ہے جس نے ہمیں اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ دراصل عقیدہ وہ روح اصلی ہے جو مردہ جسموں میں جان ڈال دیتا ہے۔ لیٹے ہوئے کو بٹھا دیتا ہے اور بیٹھے ہوئے کو کھڑا کر دیتا ہے اور کھڑے کو رواں دواں بنا دیتا ہے۔ اس لئے جب تک ہم اپنے عقیدے کو قرآن وسنت کے تقاضے کے مطابق کر کے اپنی زندگیوں کو استوار نہیں کریں گے ہم مسلمان ملت کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ اس لئے عقیدے کی درستگی اور مضبوطی کسی بھی اصلاح وتعمیر کے عمل کا بنیادی پتھر ہے۔ لہذا اس پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔

عبادات کا حال

کہا جاتا ہے کہ ایک سالم بیج سے صحیح اور سالم پودے اُگتے ہیں۔ اگر بیج خراب ہو تو پودے بھی بیمار اور کمزور ہوتے ہیں جن کی نہ صحیح نشو ونما ہوتی ہے اور نہ ان میں ٹھیک سے پھل پھول اور پتیاں ہی آتی ہیں۔ ایسے پودے موسم کی سختی برداشت کرنے کی مطلق کوئی صلاحیت نہیں رکھتے بلکہ بہت جلد مرجھا جاتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔ آج یہی کچھ حال مسلمانوں کا ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے میں اضمحلال آگیا ہے جس نے ان کے ذہن وفکر بلکہ اخلاق واعمال سب کو گھن لگادیا ہے۔ بقول اقبال۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

نتیجے کے طور پر آج کا مسلمان ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس وقت مسلمان نہ صرف فکری اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہے اور اپنے فرائض قاعدے سے انجام نہیں دے رہا بلکہ ایک مسلمان کے جو بنیادی صفات ہوتے ہیں ان سے بھی عاری ہے۔ صرف خاندانی اور پیدائشی مسلمان ہے۔ اس کے اندر نہ عقیدے کی توانائی ہے نہ اعمال کا حسن ہے اور نہ اخلاق کی خوشبو بلکہ مجموعی اعتبار سے کفار و مشرکین مسلمان سے بہتر نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے اندر اجتماعیت ہے۔ سماجی شعور ہے۔ اتحاد اور عمل کا داعیہ ہے، کچھ اعلیٰ مقصد ہے، قربانی کا جذبہ ہے دوسروں کو اپنے میں سمانے کی خواہش ہے، کچھ کرنے اور کرگزرنے کی لگن ہے۔ یہ چیزیں مسلمانوں میں بالعموم مفقود ہیں۔ اس لئے وہ ہر جگہ اور ہر معاملے میں داعی کے بجائے مدعو ہیں۔ مانو یہ انٹرنیشنل فقیروں کا ایک گروہ ہے جو عقائد و اعمال سے لے کر روٹی کپڑہ اور تحفظ ہر چیز مانگتا ہے اور دنیا سے اسے ذلت و رسوائی کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔ اس وقت اس میں کوئی غیرت و حمیت باقی نہیں ہے اور شاید اسی وجہ سے اس کی دنیا میں کہیں کوئی عزت نہیں ہے۔ جو آتا ہے اور جو چاہتا ہے دو ٹھوکر لگا کر گذر جاتا ہے عقیدے کی کمزوری کا سب سے پہلا اثر عبادات اور اخلاقیات پر پڑتا ہے۔ آج مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی بلا مبالغہ 90%(نوے فیصد) آبادی نماز جیسے فرض سے غافل ہے جو کسی حال میں معاف

نہیں ہے۔ جب ایک شخص کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہے تو سب سے پہلے نماز اس پر فرض ہو جاتا ہے۔ یہ نماز ہی ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ مومن ہے یا کافر۔ حضورؐ نے فرمایا بندے اور کافر کے درمیان فرق صرف نماز ہے۔ یعنی بندہ مومن نماز ادا کرتا ہے اور کافر اس کا انکار۔ اب جو شخص ایمان لانے کے بعد نماز جیسے فرض کو ادا نہیں کرتا وہ مسلمان کیسے ہو سکتا ہے؟ آپؐ کا ارشاد ہے۔ نماز دین کا ستون ہے جس نے نماز قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے نماز کو ڈھادیا اس نے دین کو ڈھادیا۔ گویا جو مسلمان ہو کر نماز ادا نہیں کرتا اس نے اس گھر کو ڈھادیا جس میں رہنے کا وہ دعوی کرتا ہے اور دین کو ڈھانے والا مسلمان کیسے ہو سکتا ہے؟

نماز کی فرضیت کا یہ عالم ہے کہ آدمی چاہے سفر میں ہو یا حضر میں، بیمار ہو یا صحت مند، حالت امن میں ہو یا حالت جنگ میں، نماز ہر جگہ اور ہر حال میں فرض ہے۔ اس لئے اللہ نے پوری دنیا کو مسلمانوں کے لئے مسجد بنایا یعنی مسلمان جہاں پر بھی ہو اور جس حال میں ہو وہاں نماز ادا کر سکتا ہے چاہے وہ دریا ہو، پہاڑ ہو، سمندر ہو، زمین ہو، سواری پر ہو یا پیدل چل رہا ہو یا ہوا میں اڑ رہا ہو، کسی حال میں کسی مقام پر نماز کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی۔ نماز اسلام کی ایک ایسی علامت ہے کہ مدینے کے منافق نماز کی عدم ادائیگی سے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کا نفاق ظاہر نہ ہو جائے اور وہ پکڑے نہ جائیں۔ جبکہ آج کا مسلمان اس کی پوری کی پوری آبادی چند نفوس کو چھوڑ کر اس فرض کی ادائیگی سے غافل ہے اس میں صرف جاہل اور ان پڑھ لوگ نہیں ہیں جن کی اکثریت ہے بلکہ خاصے پڑھے لکھے لوگ جن میں ڈاکٹر بھی ہیں، انجنیئر بھی، پروفیسر بھی اور افسر بھی، تاجر، مزدور، مہاجن، تعلیم یافتہ، دولت مند، خوشحال اور بدحال، جوان

اور صحت مند، بوڑھے اور بچے اور عورتیں بھی ہیں۔ کہنے کے لئے ایک ایک محلّہ میں سیکڑوں اور ہزاروں کی آبادی ہے لیکن مسجدیں آج بھی خالی ہیں۔ یہ کیوں اور کیسے ہوا؟ کسی کو اس پر شرمندگی اور ندامت نہیں ہے۔ بلکہ اس کی زبردست کوشش کرنے کے باوجود لوگ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ حضورؐ کے سامنے ایک نوجوان حاضر ہوا اس نے اسلام لانے کی خواہش ظاہر کی مگر اس نے تمام قبیح اعمال کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ آخر میں اس نے یہ بھی کہا کہ وہ نماز نہیں پڑھے گا۔ حضورؐ جو اس کی ساری بات خاموشی سے سنتے رہے، جب نماز پڑھنے سے اس نے انکار کیا تو آپ نے فرمایا 'جس میں نماز نہیں اس میں کوئی بھلائی نہیں'۔ یعنی بعض اعمال ایسے ہیں جس میں توقف برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن نماز کے بارے میں ایک لمحہ کی بھی چھوٹ نہیں دی جاسکتی کیونکہ نماز ہی وہ کڑی ہے جو بندے کو خدا سے جوڑتی ہے جب تک یہ کڑی قائم نہیں ہوگی بندے کا خدا سے رشتہ استوار نہیں ہو سکتا پھر اس کے بعد اس کا مسلمان ہونا ایک دعویٰ بلا دلیل ہے جس کو اسلامی شریعت کبھی تسلیم نہیں کرتی۔ اس لئے ایک بے نمازی مسلمان، دنیا کے رجسٹر میں مسلمان مانا جائے تو مانا جائے خدا کے رجسٹر میں اس کا شمار مسلمانوں میں نہیں ہوگا۔

لیکن یہ سب کچھ سننے اور جاننے کے باوجود مسلمان کل بھی نماز سے غافل تھے اور آج بھی ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ دین کے اور اعمال اور معاملات کے بارے میں تو لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی صحیح طور پر تبلیغ نہیں کی جاتی دوسرے اس میں اختلاف کی وجہ سے لوگوں میں بددلی اور بے عملی پائی جاتی ہے لیکن نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کی ہر مجلس اور محفل میں تلقین کی جاتی ہے تمام فرقوں اور جماعتوں

کے لوگ نماز کی فرضیت اور اس کے اہتمام پر زور دیتے ہیں۔ میلاد کی محفلیں ہو یا سیرت کے جلسے جمعہ اور عیدین کا خطبہ ہو یا جماعتوں کے اجتماعات اور دعوتی روابط ہر موقع پر ہر کوئی نماز کی تلقین کرتا نظر آتا ہے اس کے باوجود مسلمانوں میں نماز سے اس درجہ غفلت ان کے ایمان کی کمزوری نہیں تو اور کیا ہے۔ بہت سے پڑھے لکھے صاحب رتبہ مسلمان مولویوں پر ان کے آپسی اختلافات کی وجہ سے بہت منہ آتے ہیں اور اپنے کمال علم کے زعم میں ان پر رکیک سے رکیک حملہ کرنے سے باز نہیں آتے لیکن جس معاملہ میں تمام مولوی، جماعتیں، تمام ادارے متفق ہو کر آواز لگاتے ہیں اس میں مسلمانوں میں یہ کوتاہی عمل کیوں؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ مجموعی طور پر ملت اسلام سے بہت دور جارہی ہے اور کوئی آواز اسلام کی طرف ان کو واپس لانے میں کامیاب نہیں ہے یہ محض ان کے نفس کا روگ ہے جس کو اختلاف کے بہانے ایک لازمی فرض سے غفلت کا شاخسانہ مانتے ہیں۔ شاید اسی لئے اقبال نے سوال کیا:

اے مسلمان اپنے دل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ
ہوگیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم؟

اور جب تک اللہ کے بندوں سے حرم خالی رہے گا امت کے مستقبل پر ایک سوالیہ نشان بنا رہے گا۔

نماز کے بعد روزہ اسلام کی دوسری بڑی عبادت ہے جو ہر عاقل، بالغ، صحت مند مرد و عورت مسلمان پر فرض ہے چاہے وہ جاہل ہو یا عالم امیر ہو یا غریب۔ بیمار، ایسے ضعیف جو روزہ رکھنے کی قدرت نہیں رکھتے، مسافر، حائضہ اور حاملہ خواتین پر رمضان کے دنوں میں روزے میں چھوٹ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص بلا

عذر شرعی روزہ نہیں رکھتا تو شریعت کی نظر میں وہ ایک ایسا شخص ہے جس کا خون اس جرم کی وجہ سے جائز ہو جاتا ہے۔ اگر کسی ملک میں اسلامی شریعت نافذ ہے یعنی اسلامی حکومت قائم ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ پبلک آڈر قائم کرنے کے ساتھ ساتھ نماز اور روزے کا اہتمام بھی کرائے اور جو اس میں کوتاہی برتیں ان پر حد جاری کرے۔ لیکن ظاہر سی بات ہے اس طرح کے احکامات بذریعہ قوت نافذ نہیں کرائے جاسکتے جب تک لوگوں کے دلوں میں کسی چیز کی فرضیت اور اس کی بجاآوری کا احساس پوری مضبوطی کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔ باہری دباؤ کے ذریعے اس کا نفاذ مشکل ہے۔ وہ بھی روزہ جیسا فرض کہ کوئی شخص چوری چھپے کھاپی لے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اس لئے روزہ کو ایمان کی علامت مانا گیا ہے۔ اس دھرتی پر لوگ ان دیکھے خدا کی عملی اطاعت کس طرح کرتے ہیں اس کا اظہار روزے کی فرضیت سے ہوتا ہے۔ ایک آدمی طلوع آفتاب سے قبل ایک خاص وقت سے اپنے اوپر کھانا پینا حرام کرلیتا ہے اور غروب آفتاب کے بعد ایک خاص وقت میں کھانا پینا شروع کردیتا ہے۔ یہ کس کا حکم ہے جس کی پاسداری میں وہ کھانا پینا روک دیتا ہے اور پھر کس کے حکم سے کھانا پینا شروع کردیتا ہے۔ گویا روزہ اطاعت رب کا داعیہ پیدا کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ بندہ جب کھانا اور پانی جیسی جائز، حلال چیز کو اللہ کے حکم سے چھوڑ سکتا ہے تو جو چیز حرام، ناجائز اور فضول ہے کیا اسے اللہ کے حکم سے نہیں چھوڑ سکتا؟ اس کو اصطلاح شریعت میں تقویٰ کہتے ہیں اور روزہ اسی تقویٰ کی صفت پیدا کرنے کے لئے فرض کیا گیا ہے جس سے انسانی معاشرہ میں اللہ کی کبریائی کا ڈنکا بجتا ہے۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جو روزے کی اس معنویت کو سمجھتے ہیں۔ لوگوں نے اور عبادات کی طرح روزہ کو بھی رسمی عبادت بنادیا ہے تاہم ملت میں

روزے کا اہتمام کسی اور فرض کے مقابلے کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ان کی صحیح تربیت کر کے ان کو اس کے باضابطہ التزام کی طرف راغب کرنا چاہئے۔

اس وقت بھوک مرنے کی حد تک 40%لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ جن میں عامی اور درمیانی درجے کے مسلمانوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ جو روشن خیال اور فارغ البال سمجھا جاتا ہے وہ روزے کو ایک فضول عمل سمجھتا ہے اور اسے غریبوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کی عبادت مانتا ہے۔ آج ہمارے سیاسی قائدین، اعلیٰ افسران، اشتراکیت زدہ مسلمان اور مغربی تہذیب کے نقال، جو سیاسی افطار پارٹیوں میں بڑی بڑی کلغی لگاکر شریک ہوتے ہیں اور سیکولرزم اور قومی یکجہتی کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں یہ سب کے سب بے روزہ دار ہوتے ہیں جو اسے ایک فضول عبادت مانتے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ادھر حال کے دنوں میں ہندو مسلم جو سیاسی لیڈر شپ ملک میں ابھری ہے اس میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جو ہندو لیڈر شپ ہے ان کا ہر چھوٹا بڑا بڑے اہتمام سے پوجاپاٹ کرتا ہے وہ اپنے مصروف اوقات میں اس کے لئے وقت فارغ رکھتا ہے اور اپنے پورے مذہبی علامات کے ساتھ پبلک میں آتا ہے اور اسے اپنے کلچر کا لازمی حصہ مانتا ہے۔ یہ بات صرف بی جے پی اور آر اس اس برانڈ کے لیڈروں میں ہی نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں کانگریس، شوسلسٹ، سینٹرسٹ بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں میں بھی یہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ ہندو دھرم اور سنسکرتی کو پانی پی کر کوستے ہیں اور اسے منوادی کہتے ہیں۔ بیک وارڈ اور ہریجن لیڈر شپ بھی پوجاپارٹ اور مذہبی رسموں کا اعلانیہ اہتمام اور اظہار کرتی ہیں۔ اس کے برعکس جو مسلمان لیڈر ہوتے ہیں وہ اگر سیاست میں آنے سے قبل

داڑھی رکھتے ہوتے ہیں اور نماز پڑھتے ہوتے ہیں تو دھیرے دھیرے ان کی داڑھی اتنی چھوٹی ہوتی جاتی ہے اور نماز کے اہتمام میں اتنی کوتاہی ہو جاتی ہے کہ داڑھی بھی غائب اور نماز بھی غائب۔ باقی لیڈران نماز روزے سے بالکل آزاد شکل صورت عادات اطوار بول چال، کردار واخلاق ہر اعتبار سے غیر اسلامی بلکہ اسلام دشمن تہذیب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ آج کل مسلمان لیڈروں میں غیر مسلم عورتوں سے شادی کرنے کی ایک وبا چل پڑی ہے جس کے نتیجے میں ان کا آدھا اسلام تو وہیں رخصت ہو جاتا ہے اور ان کی اولادیں اپنے ماں کے دین پر جارہتی ہیں۔ وہ کچھ ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں بہر حال وہ مسلمان نہیں رہتے۔ میں یہاں نام گنوانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہ حال جب بڑے بڑے لیڈروں کے خانوادے کا ہے جن کی اسلامیت کبھی مسلم مانی جاتی تھی تو چھوٹے ٹٹ پونجیے لیڈروں کو کون پوچھتا ہے۔

بہر حال یہ لیڈرشب اور ان کے زیر اثر جو عوام اور خواص ہیں وہ روزہ جیسی عبادت کو ایک مذاق سمجھتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں میں روزہ رکھنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔

مسلمانوں کا دوسرا طبقہ جو غربت اور جہالت کی زندگی جی رہا ہے اور سخت جسمانی محنت کرتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہی نہیں کے روزہ اس پر فرض ہے بسا اوقات اس کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ یہ طبقہ ہماری نفرت کا نہیں توجہ اور ہمدردی کا طالب ہے اور اس حدیث کی منہ بولتی تصویر پیش کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ غربت آدمی کو کفر سے قریب کر دیتی ہے اور جہاں غربت اور جہالت دونوں ہو وہاں آدمی کا دین کیا اور اس کا ایمان کیا؟ غریب آدمی کے لئے دوروٹی کا حصول زندگی کی

سب سے بڑی قدر ہوتی ہے جس کو وہ کبھی کبھی اپنے گھر کی عزت بیچ کر بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سارے غریب آوارہ اور بدچلن نہیں ہوتے۔ لہذا ایسے غریبوں کے لئے ان کی صحیح تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ وہ وسائل اور ذرائع فراہم کرنے چاہئے تاکہ وہ روزہ، نماز جیسے فرائض کے التزام کے متحمل بن سکیں۔ لہذا وہ لوگ جو تبلیغ دین میں لگے ہیں اور کسی صالح انقلاب کے خواہش مند ہیں، ان کو ان امور کی طرف بھرپور توجہ دینی چاہئے۔ اگر آپ قرآن پاک کا مطالعہ کریں بالخصوص مکی سورتوں کو غور سے پڑھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ قرآن پاک نے بھوک کے مسئلہ سے نپٹنے کے لئے کتنی تاکید کی ہے اور کیا کیا احکامات وترغیبات دیئے ہیں۔ لہذا اسلامی تحریکات کو غربت اور جہالت ان دو لازمی برائیوں کے خاتمے کے لئے بھرپور کوشش کرنی چاہئے اور ان دونوں امور کو اپنی اجتماعی سرگرمی کا حصہ بنانا چاہئے۔ یہ چیزیں محض اخلاقی تعلیمات کی حد تک ہی نہ ہوں بلکہ اب میکنزم تیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے یہ مسئلہ لازمی طور پر حل ہوتا ہو اس باب میں اسلامی نظام زکوۃ کو نئے انداز سے مضبوط اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

زکوۃ اسلام کا تیسرا رکن اور مالی عبادت ہے۔ یہ ہر اس مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے جس کے پاس نصاب سے زائد مال و دولت ہو۔ زکوۃ ہر طرح کے مالی اور تجارتی وسائل پر عائد ہوتا ہے۔ زکوۃ ہر طرح کے مال ودولت پر 2½ فیصد سالانہ کی شرح سے ادا کرنا واجب ہے۔ زمینی پیداوار پر اگر آب پاشی کی گئی ہو تو 1/20 اور آب پاشی نہیں کی گئی ہو تو 1/10 کی شرح سے دینا واجب ہے۔

زکوۃ کا لغوی مفہوم پاک کرنا ہے۔ یہ مال ودولت کو نقائص سے پاک کرتا

ہے۔ زکوۃ کی ادائیگی سے انسان کا دل مال و دولت کی محبت سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کے اندر حرص و ہوس کے بجائے انفاق اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

زکوۃ کو قرآن پاک میں سائل اور محروم کا حق قرار دیا گیا ہے جس کی ادائیگی ہر حال میں واجب ہے۔ لہذا زکوۃ مسلمان مال داروں سے لی جائے گی اور مسلمان غریبوں کو دی جائے گی۔ زکوۃ اسلام کے نظام کفالت کا لازمی حصہ ہے۔ اسلامی حکومت اور اگر اسلامی حکومت نہ ہو تو اسلامی معاشرہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ زکوۃ کو اجتماعی طور پر وصول کرے اور ایک نظام کے تحت، منشاء شریعت کے مطابق (قرآن پاک میں زکوۃ کے رقوم کو جن مدات میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے) خرچ کرے۔ ایک شخص کے اسلامی برادری میں شامل ہونے کے لئے جو شرائط لگائے گئے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ نماز ادا کرتا ہو اور اس پر زکوۃ کی جو رقم واجب ہوتی ہے اس کو ادا کرتا ہو تبھی وہ اسلامی برادری میں شامل ہوگا۔ اگر ایک شخص نماز کا پابند ہو مگر صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوۃ ادا نہ کرتا ہو یا زکوۃ ادا کرنے سے انکار کرتا ہو تو اولاً وہ اسلامی برادری سے الگ رہے گا اور دوم اس سے جنگ کی جائے گی یا تادیبی کارروائی کی جائے گی تاکہ وہ زکوۃ ادا کرنے لگے۔ زکوۃ کوئی بھیک نہیں ہے جس کا دینا یا نہ دینا دینے والے کی مرضی پر ہے بلکہ وہ لازمی مالی عبادت ہے جو ہر صاحب نصاب کو دینا ہی ہوگا۔

ورنہ اس معاملہ میں جبر کرنا جائز ہے۔ آج چونکہ اسلامی حکومت نہیں ہے اور مسلمان معاشرہ اتنا منظم اور مضبوط نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی فرائض دینی کی ادائیگی میں کوتاہی برتے تو اس کے خلاف جنگ یا تادیبی کارروائی کر سکے، اس صورت میں اگر کوئی شخص زکوۃ ادا نہیں کرتا تو قرآن پاک میں اس کے سلسلے میں سخت وعیدیں

آئی ہیں اور ایسا شخص خدا کے غضب اور اس کے بدترین عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ لہذا زکوۃ کے باب میں مسلمانوں کو بہت سنجیدہ اور حساس ہونا چاہئے۔

ان تمام باتوں کے باوجود بہت سے دولت مند لوگ زکوۃ کی عباداتی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے اور اس کی ادائیگی سے پہلو تہی برتتے ہیں اگر دیتے بھی ہیں تو اس کے نصابی آداب سے بے پروا ہو کر بطور بھیک دیتے ہیں۔ جس سے نہ تو سماج کی ضرورت پوری ہوتی ہے اور نہ شریعت کا منشاہی پورا ہوتا ہے بلکہ ایک طرف سماج کے محروم طبقات غریب، بیوہ، یتیم، مسکین، اپاہج، معذور، بیمار، بے کار، مصیبت زدہ، مسافر، مقروض، غلام، قیدی اور طالب علم کی ضرورت پوری نہیں ہوتی بلکہ ان طبقات کے عزت نفس کا سودا ہوتا ہے اور ان کی بھیک منگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

دراصل زکوۃ نماز کی طرح انفرادی طور پر ادا کرنے کی چیز نہیں ہے۔ جس طرح فرض نماز باجماعت ادا کرنا چاہئے اسی طرح فرض انفاق یعنی زکوۃ اجتماعی طور پر ادا کرنا چاہئے۔ نفل نماز کی طرح نفل انفاق جو آپ نصاب سے زائد کرنا چاہتے ہیں اس سلسلے میں انفرادی طور پر ادا کرنے کی اجازت ہے۔ بلکہ ایسا انفاق بغیر کوئی احسان کے پوری خاموشی اور رازداری کے ساتھ دینا افضل ہے۔ بہر حال زکوۃ انفرادی طور پر ادا کرنے کا مطلب ہے متذکرہ بالا طبقوں میں بھیک منگی کی عادت ڈالنا جو قومی غیرت کے منافی ہے۔ آج مسلمانوں میں بھیک منگوں کی تعداد دوسری تمام قوموں سے زیادہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر محنت کرنے اور حالات کی سختی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے نیز غیرت و عزت نفس کے ساتھ جینے کا داعیہ کم ہے۔ ہم چھوٹی بڑی ضرورت پر فوراً ہاتھ پھیلا دیتے ہیں، دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے

یہاں ایسے اجتماعی اداروں کا فقدان ہے جہاں ضرورت مندوں کی مناسب طور پر کفالت ہوتی ہو۔ لہذا ہمیں ہر دو محاذ پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ آج سے کچھ دنوں پہلے ہندوستان کے ایک موقر رسالے میں سندھی کمیونیٹی پر ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس میں مقالہ نگاروں نے تقسیم ملک کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کا نقشہ کھینچا تھا، اس تباہی میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، سندھی، پنجابی، بہاری، بنگالی سب شریک تھے۔ تقسیم ملک کی وجہ سے ہزاروں خاندان تباہ ہوئے لاکھوں افراد کی جانیں گئیں اور اربوں کھڑوں کی مالیت کا نقصان ہوا۔ اس تباہی کے نتیجے میں ہزاروں لوگ جو کبھی عزت کی زندگی گذارتے تھے بھیک مانگنے پر مجبور ہوئے لیکن مقالہ نگاروں نے لکھا تھا کہ اتنے بڑے حادثہ کے باوجود ایک بھی سندھی کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا گیا۔ کم وبیش یہی حال سکھوں کا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟ اولاً ان قوموں میں بھیک مانگنے کا رواج نہیں ہے۔ دوسرے یہ زیادہ تر تجارت پیشہ لوگ ہیں اس لئے ان میں غریب لوگوں کی تعداد کم ہے۔ تیسرے ان کے یہاں ایسے اجتماعی ادارے ہیں جو لوگوں کو کسی مصیبت کے وقت ضروری امداد بہم پہنچاتے ہیں تاکہ یہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ چوتھے ان کے اندر غیرت نفس پائی جاتی ہے اور ہر حال میں محنت کر کے روزی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وقتی طور پر وہ کوئی امداد قبول کریں یہ اور بات ہے لیکن جیسے ہی ان کو تھوڑی مہلت اور وسائل فراہم ہو جاتے ہیں چھوٹا سے چھوٹا کاروبار کر کے بھی وہ اپنی روزی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں کام کی عزت اور محنت کا داعیہ کم ہے۔ ہر چھوٹی بڑی مصیبت پر بلبلا اٹھتے ہیں اور فوراً مدد کے لئے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں اجتماعی اداروں کا فقدان

ہے جہاں ضرورت مندوں کی کفالت کا معقول انتظام ہوتا ہو شاید دنیا میں مسلمان ہی ایک قوم ہے جہاں بھیک منگوں کی ایک پوری برادری پائی جاتی ہے جس کا خاندانی پیشہ بھیک مانگنا ہے۔ انفاق کے اجتماعی اداروں کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ لوگ جو ثواب کی نیت سے کچھ خرچ کرنا چاہتے ہیں انفرادی طور پر خرچ کرتے ہیں۔ یہ رقم نہ تو اتنی ہوتی ہے کہ ایک شخص کی پوری کفالت کر سکے اور نہ اس کا کوئی دائمی اور معقول انتظام ہے۔ اس لئے جب ایک آدمی کسی ضرورت کے تحت ہاتھ پھیلا دیتا ہے اور اس کی غیرت رخصت ہو جاتی ہے پھر وہ صحت مند اور تندرست ہونے کے باوجود کوئی جسمانی محنت کرنے کے بجائے بھیک مانگنے کو ترجیح دیتا ہے۔

اسلام کا نظام زکوۃ اس طرح کے تمام منفی رجحانات پر روک لگاتا ہے۔ یہ لینے والوں اور دینے والوں دونوں کو کچھ آداب کا پابند بناتا ہے۔ لہذا اس کو ایک منظم ادارے کے طور پر برپا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زکوۃ کی فرضیت سے شریعت کا جو مقصد ہے وہ حاصل ہو سکے۔ اگر زکوۃ کا منصوبہ بندی کے ساتھ اجتماعی نظم کیا جائے تو اس کے ذریعہ ان طبقات اور اداروں کی جن کو زکوۃ کی رقم دی جاسکتی ہے نہ صرف یہ کہ باعزت اور مستقل طور پر بھرپور کفالت کی جاسکتی ہے بلکہ ان کو اپنے پیروں پر کھڑا کر کے اس لائق بنایا جاسکتا ہے کہ وہ دوسروں کی کفالت کے لائق ہو جائیں اور صاحب عسرت سے صاحب ثروت بن جائیں اور زکوۃ لینے والے کے بجائے زکوۃ دینے والے بن جائیں۔ یہ چیز کوئی واہمہ نہیں ہے بلکہ قرن اول میں چشم فلک نے یہ مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں تو آج جب کہ مالی وسائل کی پہلے کے مقابلے فراوانی ہے یہ کام کیوں نہیں ہو سکتا ہے ؟ ضرورت اس جانب اجتماعی شعور کو بیدار کرنے اور ساتھ ہی ایسے

اجتماعی اداروں کو تشکیل دینے کی ہے۔ خدا جانے ہماری قوم کو کب عقل آئے گی اور وہ کب اس جانب توجہ دیگی۔

اس سلسلے میں سب سے اہم روکاوٹ مسلمانوں کے درمیان مسلکی عصبیت ہے جس نے اپنے آگے پیچھے دائیں بائیں اتنے حصار کھینچ رکھے ہیں کہ اس طرح کی کسی اجتماعی کوشش کا کامیاب ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ تاہم ہمارے علماء، دانش وروں، تاجروں، سرکردہ شخصیتوں، صحافیوں، سماجی کارکنوں اور نوجوانوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہئے اور ایک ایسا ورکنگ فورمولہ وضع کرنا چاہئے جو ملت کے تمام طبقات اور اداروں کے جذبات اور ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے روبعمل لایا جاسکے ؟ کام کی اہمیت کے پیش نظر اس پر بھرپور توجہ دینے اور ایک زوردار تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔

حج اسلام کا چوتھا عباداتی فریضہ ہے جس کو جامع عبادت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں نماز، روزہ، ذکر و تلاوت، دعاء، طواف، قربانی، ہجرت اور جہاد کے تمام عناصر موجود ہیں۔ ایک صاحب نصاب مسلمان مرد و عورت پر جو بیت الحرام تک آنے اور جانے کی استطاعت رکھتا ہو اس پر زندگی میں ایک بار حج کرنا فرض ہے۔ استطاعت کے باوجود جو حج نہیں کرتا قرآن میں اس کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے اور حدیث میں اس کے لئے سخت وعیدیں آئی ہیں بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ کوئی فرق نہیں پڑتا چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر مرے۔ اس لئے ایک مسلمان کے دل کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ ایک بار زندگی میں اللہ کے گھر کی زیارت کرلے اور روضہ اقدس پر سلام کرآئے جس کا دل اس جذبہ اور اس خیال سے خالی ہو اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔ اللہ چونکہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور وہ کسی متنفس پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ

نہیں ڈالتا اس لئے اس نے اس فرض کو تمام مسلمانوں پر عائد کرنے کے بجائے زکوۃ کی طرح صاحب نصاب اور ان مسلمانوں پر فرض کیا ہے جو اپنی بنیادی ضرورتوں کے علاوہ کعبہ شریف کے حج کے اخراجات برداشت کرسکیں۔ جن لوگوں کے پاس یہ مالی وسائل میسر نہیں ہیں ان پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا۔ لیکن شہادت کی تمنا اور حج کی خواہش یہ کسی شخص کے مومن ہونے کی دلیل ہے۔ لہذا ہماری تمام تر جدوجہد کا ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہئے کہ ہم اپنی ضرورتوں کے علاوہ کچھ بچت اس مقصد کے لئے بھی کریں کہ حج جیسی عبادت کی ادائیگی کے لائق ہوسکیں۔ اسلام مومن بندوں کو غریب نہیں کفیل دیکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ جملہ فرائض ادا کرنے کے لائق ہوسکیں اس میں صرف ایک ہی شرط ہے کہ حصول مال کا ذریعہ حلال ہونا چاہئے تبھی کوئی عبادت قابل قبول ہوگی۔ اگر حلال ذرائع اس مقدار میں میسر نہیں ہیں اور محنت کے باوجود اتنے نہیں ہیں کہ زکوۃ اور حج جیسی مالی عبادات کی بجاآوری کی جاسکے تو شریعت نے ایسے غریبوں کو محروم رکھنے کے بجائے چند دعائیہ کلمات سکھائے ہیں اور چند اخلاقی تعلیمات دی ہیں جن کی ادائیگی سے ایک شخص کو ایک حج کیا کئی کئی حج کا ثواب مل سکتا ہے دراصل کسی عبادت اور عمل کے قبول ہونے کی پہلی شرط اخلاص نیت ہے۔ اللہ کے یہاں کسی عمل کی قبولیت کے لئے عمل کرنے والے کی حیثیت یا مال کی مقدار نہیں دیکھی جاتی بلکہ اس کی نیت کا خلوص دیکھا جاتا ہے۔ یہ شرط امیر غریب مرد و عورت سب پر یکساں لاگو ہوتی ہے۔

حج ایک ایسی عبادت ہے اور اس کے اتنے فیوض وبرکات اور ثواب ہیں کہ اس کا احاطہ مشکل ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک حج مبرور کا ثواب یہ ہے کہ آدمی کے

پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور حج کے بعد گویا وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کی پیدائش آج ہوئی ہو، معصوم، منزہ من الخطاء، بشرطیکہ پھر وہ ان چیزوں میں مبتلا نہ ہو جسے وہ حج کے دوران چھوڑ کر آیا تھا۔ اب آپ بتائیے اس سے بھی کیا کوئی اور بڑی سعادت ہو سکتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی حاجیوں کا بے حد احترام کیا جاتا ہے شاید اس کے پیچھے یہی احساس موجود ہو کہ اللہ نے ان کو وہ سعادت بخشی ہے جس کے سبب یہ گناہوں سے پاک ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ کے ایسے مہمان ہیں جن کو اللہ نے بڑے انعام سے نوازا ہے۔

لیکن حج جیسی عبادت بھی آج اپنی معنویت کھو چکی ہے۔ حج کو لوگ آج کم تر درجہ کا فریضہ سمجھنے لگے ہیں، لہذا بہت سے لوگ وسائل رکھنے کے باوجود مختلف بہانوں کے تحت اس فریضہ سے غافل ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں اکثر لوگ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں حج کرتے ہیں جب گناہ کرنے پر کوئی قدرت نہیں رکھتے۔ ہمارے یہاں مثل مشہور ہے ستر چوہا کھا کے بلی چلی حج کو، میں اس مثل کے ذریعہ حج کی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتا لیکن اس ذہنیت کی طرف اشارہ ضرور کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے مالدار بالخصوص اعلیٰ مناصب پر فائز نوکری پیشہ حضرات کی ہے۔ ان آنکھوں نے ایسے حاجیوں کو بھی دیکھا ہے جو حج سے واپسی کے بعد گناہ اور ظلم میں بڑے جری ہو گئے اور جن کی زبان پر خدا کے نام کے بجائے اکثر گالیاں ہوتی ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا یہ حاجی صاحب ہیں۔ چونکہ ان کے سارے گناہ معاف ہو چکے ہیں اس لئے پوری جرات اور بے باکی کے ساتھ دوسروں کا مال غصب کرتے ہیں حق داروں کا حق نہیں دیتے کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں اور بے محابہ گالیاں بکتے ہیں۔

حج کا سب سے قیمتی زادراہ تقویٰ ہے، لیکن بہت سے لوگ اس زادراہ سے خالی ہوتے ہیں جو خالی ہاتھ جاتے ہیں اور خالی ہاتھ واپس آتے ہیں گویا بقول شاعر

ع مکہ گیا، مدینہ گیا کربلا گیا
جیسا گیا تھا لوٹ کے ویسا ہی آگیا

ہمارے بہت سے مالداروں نے حج کو سیر وسیاحت اور عرب کے کھلے بازار سے بیرونی مصنوعات کی اسمگلنگ کا ذریعہ بنالیا ہے۔ کبھی کبھی ممبئی، کلکتہ اور دیگر ایرپورٹ پر ایسے دلخراش مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جس سے خون کے آنسو رونے کو جی چاہتا ہے کہ حج کے مقدس فریضہ کو لوگوں نے کیا بنادیا ہے۔ بہر حال آج کی حقیقت یہ ہے کہ حج اپنے تمام روحانی فوائد کے باوجود ایک بے جان سی رسم ہو گئی ہے۔

مختصر یہ کہ یہ ایمان اور عبادات کا حال ہے۔ ہمارے عوام اور خواص میں ایسے لوگوں کی تعداد ساٹھ فیصد سے زیادہ ہے جو پہلا اور دوسرا کلمہ نہیں جانتے۔ ان لوگوں کی تعداد اسی فیصد ہے جو اس کے معنی سے ناواقف ہیں اور ان کی تعداد پنچانوے فیصد ہے جو اس کی تفصیلات اور مقتضیات سے ناواقف ہیں۔ اس ہمہ گیر دینی جہالت کے ماحول میں بدعقیدگی کے وہ سارے مظاہر ہماری نظروں کے سامنے ہیں جن میں ہماری ملت مبتلا ہے۔ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ ہماری نئی نسل۔۔۔ وہ نسل جو اس وقت اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہی ہے چند مستثنیات کو چھوڑ کر دینی لحاظ سے مطلق جاہل ہے۔ مجھے کئی سال آئی ڈی بی اسکالر شپ پروگرام میں بطور انٹرویور شریک ہونے کا موقع ملا ہے، جہاں عام طور پر ٹکنیکل کورسز میں تعلیم پانے والے اچھے طالب علم شریک ہوتے ہیں جو ڈاکٹری، انجینئرنگ اور اسی طرح کے اعلیٰ ٹکنکل تعلیم

حاصل کر رہے ہوتے ہیں، ان میں بیشتر طالب علم اچھے تعلیم یافتہ گھرانوں سے آتے ہیں جب ایسے لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ کلمہ کیا ہے ؟ اس کا مفہوم کیا ہے ؟ کیا انہوں نے قرآن پاک پڑھا ہے ؟ انہیں کتنی سورتیں یاد ہیں ؟ ان کو درود، ثنا، دعائے قنوت یاد ہیں یا نہیں ؟ وضو کیسے کیا جاتا ہے ؟ کتنے وقت کی نماز فرض ہے، حضورؐ کون ہیں ؟ خلفائے راشدین کا نام کیا ہے ؟ کس وقت کتنی رکعتیں فرض ہیں تو آپ کو تعجب ہو گا کہ 90-95 فیصد طالب علم ان باتوں سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ دس پانچ فیصد اگر دو چار باتیں بتاتے بھی ہیں تو ان کی معلومات ناقص ہوتی ہے اور ایسے طالب علم بھی ملے جنہوں نے آج تک خدا اور رسول کا نام نہیں سنا اور اپنی آنکھوں سے قرآن پاک نہیں دیکھا ہے۔

اب آپ بتائیں اس صورت میں لوگوں کی دینی اور ایمانی حالت کیا ہو گی دوسری طرف انہیں اسکول اور کالج میں، ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات ورسائل فلموں اور ڈراموں کے ذریعہ کلبوں اور پارٹیوں میں مستقل اور مسلسل اسلام کے خلاف اسلامی اقدار کے خلاف، اسلامی شخصیات کے خلاف، اسلامی تہذیب وثقافت کے خلاف، اسلامی تحریکات اور جماعتوں کے خلاف، مسلم تاریخ اور مسلمان حکومتوں کے خلاف منفی پروپگنڈے کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اس صورت میں خود مسلمان نسلوں میں اسلام کے خلاف اور اپنی تہذیب وثقافت کے خلاف نفرت وحقارت، احساس کمتری اور بددلی پیدا نہیں ہو گی تو کیا ہو گا۔ اس صورت میں کیا کسی اچھے مستقبل کی امید کی جاسکتی ہے ؟ یہ صورتحال کی حساس دل کو کتنا بے چین کرنے والا ہے۔ اس کا اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری ملت کے جذبات مردہ ہو گئے ہیں اور انہیں

کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

جب ایمان اتنا کمزور ہو گا تو عبادات اور اخلاقیات میں بگاڑ نہ پیدا ہو یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آج مسلمانوں میں مشکل سے ۵ سے ۱۰ فیصد لوگ نماز پڑھتے ہیں چالیس فیصد لوگ روزہ رکھتے ہیں، ایک فیصد صاحب نصاب لوگ زکوۃ کا اہتمام کرتے ہیں اور وسعت واستطاعت رکھنے کے باوجود ایک لاکھ لوگوں میں ایک دو آدمی حج کو جاتے ہیں رہا ان عبادات کو ان کے مقتضیات کو سمجھ کر ادا کرنے کی بات تو اس جانب کوئی توجہ ہی نہیں دیتا۔ نماز اللہ کی یاد کے لئے فرض کیا گیا ہے جو آدمی کا رشتہ اللہ سے مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے اور اس کا مقصد احساس بندگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ گناہ اور بے حیائی کے کاموں سے آدمی کو بچاتا ہے۔ روزہ تقویٰ کی صفت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، زکوۃ حب مال سے بچنے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال خرچ کرنے کا ذوق پیدا کرتا ہے اور حج خدا کی راہ میں سفر کرنے اور ہجرت کرنے نیز قربانی دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان عبادات سے جہاں ایک طرف خدا کی بندگی مقصود ہے وہیں مسلمان معاشرہ میں بھائی چارگی، مساوات، دردمندی، اخلاص اور تعاون نیز قربانی اور اللہ کی راہ میں مشقت برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کرنا بھی مقصود ہے۔ روزہ مالداروں کو یہ بتاتا ہے کہ بھوک پیاس کیا ہوتی ہے۔ اس تجربہ سے غریب آدمی کا درد محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ آدمی کے اندر ناموافق حالات کو برداشت کرنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ صبر جو استقامت کی علامت ہے اس عبادت کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔ زکوۃ مال کی محبت کے بجائے بندگان خدا کی محبت کا جذبہ پیدا کرتا ہے انسان کو حرص وہوس سے پاک کرتا ہے اور اپنی محنت کی حلال کمائی کو صرف اپنی ذات اور اپنے گھر والوں پر ہی خرچ کرنے کو نہیں

بلکہ اپنے غریب رشتہ داروں اور دیگر دینی بھائیوں پر خرچ کرنے کا ذوق پیدا کرتا ہے۔ اگر مسلمان معاشرہ اسلامی عبادات اور اس کے مقتضیات کو سمجھ لے اور شعور کے ساتھ اس کی بجاآوری کرنے لگے تو یہ معاشرہ اتنا پاکیزہ اور مضبوط ہوگا جس کی طہارت و مضبوطی کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن وائے افسوس یہاں تو پورا کا پورا سرمایہ ڈوبا جارہا ہے اور کسی کو اس کی فکر نہیں ہے۔

اگر یہ کفر وارتداد نہیں ہے تو کیا ہے۔ ہمارے دلوں کو نفاق کا روگ لگ چکا ہے۔ لہذا وہ لوگ جو کسی نہ کسی طرح کی دینی زندگی جی رہے ہیں اور خود کو مسلمان کہتے ہیں ان کو اپنا سخت احتساب کرنا چاہئے اور اپنے ایمان وعبادات کی فکر کرنی چاہئے۔

مگر جو لوگ دین دار ہیں وہ مسلکوں اور جماعتوں کے ایسے مکر جال میں پھنسے ہیں جس سے نکلنے کی نہ تو خواہش ہے اور نہ کوشش۔ اس کی فکر بہت کم ہے کہ لوگوں میں بے دینی وبائی مرض کی طرح پھیل رہی ہے لوگ نماز روزے سے غافل ہیں۔ مگر اس کی فکر بہت ہے کہ کس طرح لوگوں کو اپنے مسلک اور اپنی جماعت میں شریک کیا جائے۔ اس کے لئے عوام کے سامنے ایسی ایسی دلائل، دوراز کار اور غیر ضروری مباحث کو چھیڑ کر ہر جگہ فتنہ کا بازار گرم کیا جاتا ہے تاکہ کوئی مسلمان آبادی انتشار وافتراق سے محفوظ نہ رہے اور آپس میں ہی ایک دوسرے کا سر توڑنے پر آمادہ رہے۔ چنانچہ آپ جہاں بھی چلے جائیں آپ کو مسلمان آبادیوں میں ایک ہمہ گیر انتشار ملے گا جو ہمارے صاحبان جبہ ودستار کے فیض عام کا مظہر ہے۔ انہیں اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ کا دین برباد ہوتا ہے، ان کی امت گمراہ ہوتی ہے، اللہ کا حکم کھوٹا ہوتا ہے۔ انہیں اپنی محفوظ چراہ گاہ چاہئے۔ دین کے نام پر اس وقت جیسی دوکانداری

ہو رہی ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ جب کسی قوم کے علماء اور حکمراں دنیا دار ہو جائیں تو وہ قوم کیسے دین دار ہو سکتی ہے؟

پراگندہ معاشرتی آداب:

عقائد کے بگاڑ کا اثر صرف عبادات پر ہی نہیں عام اخلاق اور معاشرتی آداب پر بھی پڑتا ہے۔ پھل اپنے بیج سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ دھتورے کے پیڑ سے گلاب کا پھول حاصل نہیں کر سکتے اور کٹھل کے درخت سے آم آپ کو نہیں مل سکتا۔ ہر چیز کی اپنی کچھ خصوصیت ہوتی ہیں جو اپنے فطری نتائج پیدا کرتی ہیں۔ بیمار آدمی سے آپ صحت مند اور توانا آدمی کی طرح صحت وتوانائی کی توقع نہیں کر سکتے اسی طرح کسی بدکردار آدمی سے تقویٰ کی امید فضول ہے جب تک کہ وہ توبہ نہیں کر لے اور اپنی سابقہ زندگی سے باز نہ آجائے۔ ٹھیک اسی طرح جب آدمی کے عقائد میں اضمحلال اور فساد پیدا ہو جائے گا تو اس کے اعمال پراگندہ اور اخلاق گھناؤنے ہوں گے۔ آج ہماری اخلاقی گراوٹ اور پراگندہ معاشرتی آداب کی شاید یہی وجہ ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے پاس اپنی اخلاقی برتری ثابت کرنے کے لئے سوائے تاریخی حوالوں کے اور کچھ نہیں ہے جن کے بارے میں قرآن کا صاف صاف اعلان ہے 'وہ کچھ لوگ تھے جو گذر گئے، ان کے اعمال ان کے لئے تھے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے، تم سے صرف تمہارے بارے میں پوچھا جائے گا ان کے بارے میں نہیں' لیکن ہم نہ معلوم کن خام خیالیوں میں مبتلا ہیں۔ ہمارا لباس، پوشاک، رہن سہن، کھانا پینا، ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا، بول چال، اجتماعی حکمت عملی، معاملات وتعلقات کیا کسی صاحب عقیدہ مہذب اور ارتقاپزیر ملت کی کوئی مثال

پیش کرتے ہیں۔ ہر جگہ بھدہ پن اور بے ڈھنگا پن ہے، بے شعوری اور لاپرواہی ہے۔ کوئی اجتماعی شعور نہیں، حکمت نہیں، دانائی نہیں، سنجیدہ غوروفکر نہیں، ہر جگہ بھونڈاپن ہے، نقالی ہے سطحیت ہے، جذباتیت ہے، حکمت سے عاری شجاعت بلکہ غنڈہ گردی اور آوارہ گردی ہے۔ پوری قوم کے سوچنے کا انداز منفی ہے، بے اعتبار سہاروں پر بہت بھروسہ ہے، قوت بازو شل ہیں۔ خود اعتمادی رخصت ہو چکی ہے، عزائم سرد ہیں۔ زندگی اور حرارت کی رمق دیکھنے کو نہیں ملتی۔ جس رسول نے اخلاق وتہذیب کا سبق، طہارت ونظافت کا درس بڑے اہتمام سے سکھایا تھا آج ہم نے سب الٹ دیا ہے۔ سنتیں پامال ہو رہی ہیں۔ بدعات کا زور ہے۔ ضروری چیزوں پر کوئی توجہ نہیں اور غیر ضروری چیزوں کی بڑی اہمیت ہے، فروعات مسلمات ہو گئے ہیں اور مسلمات کو فروعات جیسی اہمیت بھی حاصل نہیں ہے۔ ہم بھوکوں کو کھانا نہیں کھلاتے، بیماروں کی تیمارداری نہیں کرتے، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش نہیں آتے۔ بھائیوں کی خبر گیری نہیں کرتے، بہنوں کی مدد نہیں کرتے۔ اپاہجوں کا سہارا نہیں بنتے۔ یتیموں کا مال غصب کر لیتے ہیں، ان کے سر پر دست شفقت نہیں رکھتے، بیواؤں کی دیکھ بھال نہیں کرتے، غریبوں کی مدد نہیں کرتے، مظلوموں کا آنسو نہیں پوچھتے۔ ظالموں سے نہیں لڑتے، حق کی حمائت نہیں کرتے، برائی کے خلاف بغاوت نہیں کرتے۔ جابروں کا ہاتھ نہیں تھامتے، مجبوروں کا سہارا نہیں بنتے۔ ہاں اپنے اوپر پڑی افتاد پر ضرور بلبلا اٹھتے ہیں اور دوسروں کو امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہم والد کی جائداد میں بہنوں کا حصہ نہیں دیتے، اپنی جائداد میں بیٹیوں کا حق نہیں دیتے، تلک اور جہیز کے نام پر لڑکی والوں سے غیر ضروری مطالبات کرتے ہیں،

جبکہ ہم اپنی بیویوں کی مہریں ادا نہیں کرتے، ان کے ساتھ حسن سلوک، مروت، برابری اور احترام سے پیش نہیں آتے۔ بیٹے اور بیٹیوں میں فرق کرتے ہیں۔ بیٹیوں کی تعلیم وتربیت اور کھلانے پلانے میں فرق کرتے ہیں۔ گویا اپنی ہی نسلوں کو اپنے ہاتھ سے تباہ کرنے پر تلے ہیں۔

ہر طرف جھوٹ، فریب، دھوکہ، بے ایمانی، اخلاقی دیوالیہ پن کا دار دورہ ہے۔ وہ کون سی اخلاقی برائی ہے جو آج مسلمان ملت کے افراد میں نہیں پائی جاتی۔ چوری، زنا، ڈاکہ، شراب نوشی، منشیات کا کاروبار، اسمگلنگ، جوا، ملاوٹ، کم تولنا، جھوٹ، بددیانتی، وعدہ خلافی، امانت میں خیانت کام چوری، آرام طلبی، غرض ہم ہر طرح کی اخلاقی برائی میں گلے تک ڈوبے ہوئے ہیں جس سے دنیا کی قوموں میں ہماری پہچان گم ہو گئی ہے۔ کل تک ایک مسلمان اپنی سچائی اور معاملات میں کھرا ہونے کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا آج وہ اپنے جھوٹ، بدعہدی اور بدمعاملگی کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ لگے کہ ہم نے مسلمانوں کی صرف منفی تصویر ہی دکھائی ہے اور ان کی خوبیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ دراصل یہ نقشہ ہماری اکثریت کا ہے اگر کچھ لوگ اچھے ہوتے بھی ہیں تو اکثریت کا اعتبار ہوتا ہے۔ آپ کو ہر قوم میں کچھ سچے، ایماندار، مہذب، اور انصاف پسند لوگ مل جائینگے۔ اگر ایسے چند لوگ مسلمانوں میں بھی ہوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مسلمان جو بہترین امت ہیں ان کی اکثریت کو ہر معاملہ میں بہتر ہونا چاہئے تبھی ہم بحیثیت مجموعی اس کو اچھا قرار دے سکتے ہیں اس میں شک نہیں کہ پوری کی پوری مسلمان قوم کی گاڑی انجن سمیت پٹری سے نیچے آرہی ہے اب اس میں اس کا کوئی پہیا پٹری پر ہو تو اس سے گاڑی چل تو

نہیں سکتی۔ لہٰذا امت کو یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ وہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے پوری طرح ڈی ریل ہو چکی ہے اور جب تک ہم اس کو پوری طرح پٹری پر نہیں لاتے، نہ تو اس کا بھلا ہوگا اور نہ دنیائے انسانیت کا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو صحیح صورت حال سے واقف کرایا جائے۔ ان کو آئینہ دکھایا جائے۔ ان کے امراض کی صحیح تشخیص کی جائے پھر پوری تندہی، حکمت اور دلسوزی سے ان کا علاج ڈھونڈھا جائے۔

مسلمان معاشرہ کی خرابی ایک دو نہیں بلکہ یہاں تو ہمہ تن داغدار ہے۔ جس پہلو کو چھوئیے جس معاملے کو دیکھئے، جس طرف نظر دوڑایئے ہر طرف انتشار ہے، پراگندگی ہے، اضمحلال ہے۔ آج جن چیزوں نے ہمارے اجتماعی نظام کا تانا بانا پوری طرح بکھیر کر رکھ دیا ہے، ان میں ایک بڑی وجہ ہمارا سماجی اور سیاسی انتشار ہے۔

ہم یہ پوری طرح بھول چکے ہیں کہ ہم ایک اصولی اور نظریاتی امت ہیں جس کی کچھ عالمی اور انسانی ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا میں محض ایک قوم نہیں بنایا ہے بلکہ ہمارے ذمہ کوئی کام اور پروگرام بھی دیا ہے، جس کی بجاآوری وہ ہمارے ذریعہ سے کرانا چاہتا ہے۔ ہمیں دنیا میں انسانوں کے سامنے اسلام جو اللہ کا سچا اور آخری دین ہے۔ اس کی شہادت اور اقامت کے لئے بھیجا ہے۔ ہماری ذمہ داریوں میں معروفات کا قیام اور منکرات کا ازالہ سب سے اہم ہے جس سے ہمارے لئے اور پوری انسانیت کے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک صالح، تعمیر پسند، مثبت فکر و نظر کی حامل ترقی یافتہ معاشرہ ظہور پزیر ہوتا ہے۔ جہاں ظلم ناپید، ناانصافی معدوم اور حق تلفی مفقود ہوتی ہے بلکہ سب کی سلامتی انصاف اور عزت کی ضمانت ہوتی ہے۔ لیکن آج کا مسلمان بالعموم ایسا کوئی اعلیٰ نظریاتی اساس نہیں رکھتا۔ ان طبقات کو چھوڑ

دیکھئے جو مغرب زدہ بے دین اور جاہل ہیں جن تک علم و شعور کی روشنی نہیں پہنچی ہے۔ ہمارے علمائے کرام بھی الا ماشاء اللہ اس احساس شعور اور منصب و مقام سے ناواقف ہیں یا انہوں نے اس بات کو پوری طرح بھلا دیا ہے۔ شاہین نے جب سے خاکبازی سیکھ لی ہے وہ بلندیوں پر پرواز کرنا بھول گیا ہے۔ فطری طور پر انہوں نے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اہمیت دینا شروع کیا۔ مسلک دین بن گیا فروئی امور اصولی حیثیت اختیار کر گئے پھر کیا تھا کفر ساز اداروں کی بھر مار ہو گئی اور ایک دوسرے کو کافر بنانا محبوب دینی مشغلہ بن گیا۔ تبلیغ حق کا سارا مفہوم اپنے مسلک کی حقانیت اور برتری ثابت کرنا اور دوسرے مسالک کو غیر حق اور باطل قرار دینا ٹھہرا۔ پھر وہ جنگ شروع ہوئی جو لا متناہی ہے۔ اسلام کسی کونے میں دبکا سسکیاں لے رہا ہے۔ ہر شخص اپنی تلوار سونتے اس کو ڈھونڈھ رہا ہے تاکہ اس کا قتل کر کے اس کے مزار پر اپنی ڈیرھ اینٹ کی مسجد تعمیر کرے اور اس کی لاش پر اپنے مسلک کی عمارت کھڑی کر کے دنیا کو یہ باور کرائے کہ یہی اسلام ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے وہ کفر ہے شرک ہے، زندقہ ہے، ضلالت ہے۔ گویا اصحاب کہف کا دور پھر واپس آگیا ہے، جہاں عقیدت تو پائی جاتی ہے اطاعت نہیں۔

وہ دین جس نے ساری انسانیت کو اللہ کا کنبہ اور ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیا جس نے رنگ و نسل، قوموں قبیلوں اور برادریوں کی بنیاد پر قائم عصبیتوں کو ختم کر کے وحدت آدم کا سبق پڑھایا تھا، جس نے اونچ نیچ، چھوٹے بڑے، امیر غریب، کالے گورے، چھوت اچھوت کی تمیز ختم کر کے پوری انسانی برادری کو ایک صف میں لا کھڑا کیا تھا آج اس دین کی حامل امت ان لعنتوں اور تعصبات میں گرفتار ہے جس نے ملت کی پوری اجتماعی قوت کو باہم متصادم بنا کر اس طرح تخرے بخرے کر دیا ہے کہ اس وقت

مسلمان ہی اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن بن گئے ہیں۔ اس جنگ میں عالم اور عامی، شہری، دیہاتی، چھوٹے اور بڑے سب ایک جذبہ جہاد کے ساتھ شریک ہیں اور ہر کوئی ایک دوسرے پر بازی لے جانے پر تلا ہے۔ اس ہمہ گیر بکھراؤ کے ماحول میں اتحاد کی آواز اپنے تمام تر قوی دلائل اور مضبوط اشارات کے باوجود صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی ہے۔ اور ہر کوئی انتشار کی بھٹی کا ایندھن بننے کو تیار ہے۔

ہندوستان میں مسلمان لگ بھگ ۱۵ کروڑ ہیں، ملک کے ہر حصہ اور خطہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس ملک میں مسلمانوں کی جتنی آبادی ہے وہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ اگر وہ ایک آزاد مملکت ہوں تو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا ساتواں بڑا ملک ہوتے۔ لیکن اتنی بڑی آبادی کے باوجود ہندوستان میں مسلمان بالکل بے وزن ہیں یہ صحیح ہے کہ ہم عصر قوموں اور قوتوں کے مقابلے ان کے پاس وسائل وذرائع بہت کم ہیں اور مادی لحاظ سے یہ ملک کی پس ماندہ ترین آبادی ہیں تاہم اگر سابقہ تاریخ پر نظر ڈالی جائے اور اس کا موجودہ حالات سے مقابلہ کیا جائے تو مجموعی طور پر معلوم ہوگا کہ مسلمان مادی وسائل وذرائع کے اعتبار سے پہلے ایام سے بہتر ہیں۔ جن ادوار کو مسلمانوں کا دور عروج مانا جاتا ہے وہ خواص کے عروج کا دور تھا جو مسلمانوں کی مجموعی آبادی کا کبھی پانچ فیصد سے زائد نہیں رہے جبکہ عام مسلمانوں کی حالت کیا تھی۔ عام مسلمانوں کی حالت اس وقت بھی دگرگوں تھی۔ غربت، جہالت، دین سے دوری، چھوٹے بڑے کا فرق قومی اور گروہی عصبیتیں وہ ساری خرابیاں جو آج موجود ہیں اس وقت بھی تھیں۔

دراصل ہندوستان پر نہ تو کبھی اسلام کی حکومت رہی اور نہ عام مسلمانوں کی۔

یہ کچھ خاندان تھے جو اس ملک پر حکمراں تھے اور انہوں نے اپنی خاندانی حکومت کو قائم اور مستحکم کرنے کے لئے جب جیسی پالیسی ضروری سمجھی لاگو کی۔ ان کے نزدیک عوامی فلاح، اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کو مجموعی اعتبار سے اوپر اٹھانے کی کوشش جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ حکومت اپنے وفاداروں اور باج گزاروں کے خیر وفلاح اور ترقی و مضبوطی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے اس حکومت میں اور اس کے حکمرانوں میں ہمیں ایسی ایسی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں جس کا اسلام اور مسلمان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ تو متعصب تاریخ دانوں اور سیاست دانوں کا کمال ہے کہ انہوں نے ان خاندانوں کے عہد حکومت کو اسلامی اور مسلم عہد حکومت کا نام دے کر ان کے اعمال وکردار کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال کر مسلمانوں کی موجودہ نسل سے اس کا حساب لینا چاہتے ہیں۔ اس معاملہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ہم صرف اسی بات کے حامی ہیں جو اسلام کے مطابق ہے اور حق وانصاف کے پیمانہ پر صحیح ہے۔ جو چیز اس کے خلاف ہے چاہے وہ کسی کے ذریعہ ہوا ہے، ہم اس کے طرفدار نہیں ہیں بلکہ ہم بھی اتنا ہی ناقد اور مخالف ہیں جتنا کوئی اور ہو سکتا ہے۔ یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم اپنی کمزوری چھپانے کے لئے یہ موقف اختیار کر رہے ہیں بلکہ یہی صحیح قرآنی موقف ہے جو تاریخ کے باب میں ہمیں سکھائی گئی ہے۔ آج بھی جو مسلمان حاکم اور سیاست داں ہیں ان کے بارے میں ہمارا یہی موقف ہے۔ ہم کسی مسلمان کو کافر قرار نہیں دیتے لیکن اگر وہ کفر کرتا ہے تو اس کو اسلام بھی نہیں ماننا چاہئے محض اس کا خاندانی طور پر مسلمان ہونا یا نام نہاد مسلمان ہونا اسے اس بات کا حق نہیں دیتا کہ اس کے ہر عمل پر اسلام کی مہر لگادی جائے۔ اسلام اسلام ہے اور کفر کفر۔ ایک مسلمان کفر کرے گا تو وہ کفر، اسلام نہیں

ہو جائے گا اور ایک کافر اگر صحیح کرے گا تو وہ غلط نہیں ہو جائے گا کیونکہ وہ کافر ہے۔ لہذا ہمیں یہ فرق سمجھنا ہوگا اور اس کے مطابق اپنے طرز فکر اور طرز عمل کی اصلاح کرنی ہوگی۔ ورنہ شراب کی بوتل پر آب زم زم اور آب زم زم کی بوتل پر شراب کا لیبل لگا دینے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوگی۔ اس طرح کی حرکت سے ایک شخص کو گمراہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن چیزوں کی ہیئت نہیں بدلتی۔ بہر حال یہ وضاحت بطور جملہ معترضہ ہے تاکہ اس معاملے میں ہمارا ذہن پوری طرح صاف رہے۔

نام نہاد مسلم دور اقتدار میں ان کے اندر کی کمزوریوں کا کوئی ادراک نہیں ہو سکا۔ لیکن جب ان کا بھی زوال ہو گیا تو جس طرح سمندر میں تلاطم کے نتیجے میں اندر کی ساری گندگی سطح آب پر آجاتی ہے مسلمانوں کی کمزوریاں بھی نمایاں ہونے لگیں اور یہ معلوم ہوا کہ صرف اغیار ہی نہیں بلکہ اپنوں کے ناروا سلوک کے نتیجے میں ملت صدیوں سے بیمار چلی آرہی ہے۔ جس پر کبھی کسی نے توجہ نہیں دی۔

ہماری ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہمارے پاس جس طرح حکمرانوں، صوفیا اور علماء کی تاریخ مرتب شکل میں موجود ہے ویسی کوئی عوام کی تاریخ نہیں ہے۔ در اصل اس طبقہ کو عوام کالانعام جان کر ہمیشہ اس سے بے توجہی برتی گئی جس کے نتیجے میں آج ہماری اتنی بڑی آبادی ہماری طاقت اور ہماری پونجی ہونے کے بجائے ہماری کمزوری اور ہمارا بوجھ (liability) بن گئی ہے۔ آج بھی ہمارے خواص (elite) کو ملت کی کتنی فکر ہے۔ اندنوں مسلمانوں سے سیاسی ہمدردی رکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن اس کے پیچھے کوئی اخلاص اور قربانی کا جذبہ نہیں ہے بلکہ ملت کے کاندھے پر چڑھ کر اقتدار کی اونچی کرسیوں پر پہنچنا مقصد ہوتا ہے۔ علماء ہوں (دنیادار علماء) یا سیاستداں

دونوں ملت فروشی کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے پوری ملت کو ایک چراہ گاہ بنا لیا ہے جہاں اپنے مفاد کے جانور کو چرانے کے لئے زیادہ سے زیادہ حصہ آبادی کو اپنے دام فریب میں مبتلا کرنے کے لئے خود ساختہ حدبندیاں قائم کر رکھی ہیں اور اسے بڑھانے اور وسیع تر کرنے کی نت نئی چالیں چلتے رہتے ہیں تاکہ ان کے مفادات محفوظ، حیثیت مضبوط اور اہمیت مسلم رہے۔ اپنے ذاتی اور گروہی مفاد سے اوپر اٹھ کر سوچنے والے یا تو بالکل ناپید ہیں یا پھر اتنے بے وزن کمزور گمنام اور انجان جن کی کوئی اہمیت اور پہچان نہیں ہے۔ بقول اقبال ؎

ع زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن

قیادت کے فقدان مضبوط اجتماعیت کی کمی اور مستقبل کی پیش بندی نیز منصوبہ بندی کی کمی نے پوری ملت کو ایک لاشہ بے جان بنا دیا ہے۔ جس پر ہر طرف سے چیل، کووں، کتوں اور بھیڑیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ پورے ملک میں اسے ایک کمزور اقلیت مان کر ہر سطح پر ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ لیکن انہیں اپنی اس ذلت آمیز صورتحال کا نہ احساس ہے اور نہ اس سے نکلنے کی خواہش۔ ملت کے اندرونی محاذ پر محض معمولی اور فروعی معاملات پر اتنے بڑے بڑے معرکے ہو رہے ہیں کہ خارجی محاذ پر کسی کو کچھ سوچنے اور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ملت جو کبھی پر شور پہاڑی، ندی کی طرح تھی وہ ایک گڈھے کا سڑا پانی بن گئی ہے جس میں اتنے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں جو خود اس کے لئے اور دوسروں کی صحت کے لئے بھی خطرہ بن گئے ہیں۔ وہ باتیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہے وہی باتیں سماجی اور مذہنی انتشار کا سیلابی دروازہ بن گئی ہیں۔ یہ دیوبندی اور بریلوی کس بات پر لڑ رہے ہیں؟ مقلد اور غیر مقلد کا جھگڑا کیا

ہے ؟ مسلمانوں کے مختلف فرقے، جماعتیں اور برادریاں کس لئے آپس میں متصادم ہیں ؟اس کی اصل کیا ہے۔ جواز کیا ہے ؟ اہمیت کیا ہے ؟ اگر ملت میں کوئی خرابی ہے تو دلسوزی کے ساتھ اصلاح کی جائے گی کہ اس کے لئے اعلان جنگ ضروری ہے۔ اللہ کا فرمان ہے 'لوگوں کو بلاؤ اللہ کے راستہ کی طرف حکمت کے ساتھ اچھی نصیحت کے ساتھ اور بہترین طریق بحث کے ذریعہ' [1] یہ ہدایت عام ہے اور اس میں غیر مسلموں کو اس طرح دعوت دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے باب میں تو اس سے زیادہ نرمی برتنے کی تاکید کی گئی ہے اور بتایا گیا کہ دین نصح و خیر خواہی کا نام ہے۔ خود رسولؐ کا اسوہ یہ بتایا گیا کہ ' آپ لوگوں کے لئے نرم خو واقع ہوئے ہیں ورنہ جو لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہیں وہ کب کا چھٹ چکے ہوتے' [2] پھر آج یہ انتشار کیوں ؟ اس کی دو ہی وجہ ہے پہلی اسوۂ رسول کی ناقدری اور دوسری ملی اور دینی محاذ پر ذاتی مفادات کو ترجیح۔ خود غرضی آدمی کے اندر تلخی اور عناد کے جذبات بھر دیتی ہے۔ خوئے دل نوازی رخصت ہو جاتی ہے جس کے سبب انتشار پیدا ہوتا ہے۔

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں، نہیں خوئے دل نوازی (اقبال)

یہ صریح دوکانداری اور دنیاداری ہے۔ دین کو تجارت بنانے اور ملت کو تجارتی مال بنا کر اپنے نفع کے لئے بازار میں بیچنے اور خریدنے کا عمل ہے۔ صورتحال ایسی نازک ہے کہ دور دور تک اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ جس کسی شخص سے آپ اس مسئلہ پر بات کریں وہ بھڑ جائے گا۔ لوگوں کے شخصی اور گروہی مفادات اتنی اہمیت حاصل کر گئے

1۔ پارہ ۱۴ سورۃ النحل آخری رکوع 2۔ پارہ ۴ آل عمران۔ رکوع۔ ۸

ہیں کہ وہ اس کو نظر انداز کر کے کوئی بات سننے، سمجھنے، سوچنے اور ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ بلکہ وہ میدان انتشار و افتراق کے ایسے غازی اور مجاہد ہیں جن کی ساری منطق اپنے مسلکی، گروہی اور شخصی معرکہ آرائی کو جہاد فی سبیل اللہ ثابت کرنے پر ختم ہوتی ہے۔ اس صورتحال میں اتحاد ملت کی کوشش کتنا مشکل عمل ہے اس کا اندازہ ہی کیا جا سکتا۔ اولاً تو ایسی کسی کوشش کا کامیاب ہونا مشکل ہے دوم جو لوگ اس طرح کی کوشش کرنا چاہتے ہیں اکثر ان کی نیتوں پر بھی حملہ ہوتا ہے۔ تاہم آثار یہ بتا رہے ہیں کہ ملت ابھی زندہ ہے اس لئے اس طرح کی کوشش کی جانی چاہئے۔

اگر آپ عام مسلمانوں سے ملیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ملت میں اتحاد کی خواہش پائی جاتی ہے وہ متحد ہونا چاہئے ہیں اور اس کا شدید جذبہ و احساس رکھتے ہیں۔ ایسے کئی مواقع آئے ہیں جب کہ قیادت ابھی سوچتی ہی رہی اور ملت نے از خود آگے بڑھ کر اتحاد عمل کا ثبوت دیا ہے۔ دینی تعلیم، مسلم پرسنل لاء، علی گڈھ مسلم یونیورسیٹی، بابری مسجد، اردو، فرقہ وارانہ فسادات، مسجد اقصیٰ کی آتش زدگی، رشدی کی شر انگیزی، خلیج میں امریکی جارحیت وغیرہ کے خلاف مسلمانوں نے اپنی بھرپور اتحادی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے قبل انگریزی دور اقتدار میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی خلافت کے خاتمہ کے خلاف مسلمانوں نے جس زوردار مہم کا آغاز کیا وہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں ملکی اور ملی بے داری کا ہراول دستہ ثابت ہوا جس نے اس ملک سے انگریزوں کے پاؤں اکھاڑ دئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملت کو متحد اور منظّم کیا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ملت جذباتی اور سطحی ہے، ٹھوس تعمیری کاموں کی طرف اس کا رجحان کم ہے۔ لیکن ایسے جذبات کی آبیاری عوام کا کام نہیں ہے بلکہ یہ

ہمارے زعماء کی ذمہ داری ہے۔ انہیں ایسی ذہنی اور عملی تربیت کی منصوبہ بندی کرنی چاہئے تاکہ ملت ٹھوس اور طویل المیعاد منصوبوں پر یکسوئی سے گامزن ہو سکے۔ نئی نسل میں یہ احساس اور شعور پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اتحاد کوئی غیر مرئی (Idealistic) چیز نہیں ہے۔ یا اس کا قیام خلاء میں نہیں ہو گا۔ محض ہمارا یہ کہہ دینا کہ مسلمانوں کو متحد ہو جانا چاہئے اس سے اتحاد پیدا نہیں ہو گا۔ بلکہ یہ بتانا ضروری ہے کہ اتحاد کس لئے اور کس کام کے لئے۔ جب تک ہم اس کو واضح نہیں کریں گے یہ محض ایک بے معنی بات ہو گی۔ لہٰذا اتحاد ہمیشہ Issue کی بنیاد پر ہو گا۔ آپ وہ مسائل سامنے لائیں جن پر آپ ملت کو متحد کرنا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھئے ملت اس کام کے لئے آگے آتی ہے یا نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اتحاد سے ہماری مراد کیا ہے، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام طبقات اور افراد بالکل ایک مسلک ایک جماعت، ایک فرقہ، ایک گروہ، ایک فکر اور ایک قیادت کو تسلیم کر لیں اور اب تک کی تمام حدبندیاں توڑ دیں تو یہ واہمہ اور خوش فکری تو ہو سکتی ہے کوئی عملی بات نہیں ہو گی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس وقت مسلمان جن باتوں پر آپس میں ایک دوسرے سے مختلف رائے رکھتے ہیں وہ سب کی سب غلط اور بے بنیاد ہیں یا محض نفسانیت اور مفاد پرستی کی وجہ سے ہیں بلکہ ان کی اپنی دینی اور سماجی اہمیت ہے۔ یہ نقطہ نظر کا اختلاف بھی ہے اور صواب وعدم صواب کا اختلاف بھی ہے، تقدیم وترجیح کا معاملہ بھی ہے اور سنت وبدعت کا مسئلہ بھی ہے۔ کہیں جانتے بوجھتے اور کہیں انجانے میں ایسی غلطی ہوئی ہے جو غلط ہے مگر اس پر اصرار جاری ہے اس بات میں ہماری پہلی گزارش یہ ہے کہ اختلاف کے حدود کا صحیح صحیح اندازہ لگایا

جائے اس کی نوعیت معلوم کی جائے اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فائدے اور نقصان کا جائزہ لیا جائے اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کے بارے میں ایک متعدل موقف سامنے لایا جائے۔ دوسری گذارش یہ ہے کہ اپنے مسلک اور جماعت پر کاربند رہتے ہوئے یہ دیکھا جائے کہ دوسرے مسالک اور جماعتوں سے کس طرح اشتراک عمل کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے مشترکہ امور اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون کا اصول بتایا ہے اس پر کاربند ہونے کی کوشش کی جائے۔

تیسری گذارش یہ ہے کہ ایک مدت خاص تک کے لئے مسلکی جھگڑوں کو ہوا نہ دی جائے بلکہ ان کی لے نیچے رکھی جائے اور خیر سگالی کا ایک ماحول بنایا جائے۔

چوتھی گذارش یہ ہے کہ ان امور کی نشاندہی کی جائے جن میں ملت ایک ساتھ قدم بڑھا سکتی ہے مثلاً ملت میں مشترکہ سیاسی قیادت ابھارنے، تعلیم کے فروغ، معاشی ترقی، خود حفاظتی اقدامات، معیشت وسیاست میں مناسب حصہ داری، فسطائی، غیر جمہوری دین دشمن، ملت دشمن طاقتوں کے خلاف مضبوط اتحاد وغیرہ۔ اگر ہم ان امور پر غور کرنے کے لئے سنجیدگی سے تیار ہو جائیں تو موجودہ صورتحال کو بڑی حد تک بدلا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں پہلا کام تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل بالخصوص نوجوانوں کو انتشار کا ایندھن بنانے سے بچایا جائے اور دوسرا کام یہ ہے کہ ان کو اتحاد ملت کا ذریعہ اور مقصد بنایا جائے جس کے لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں کو مسلکی اور گروہی جھگڑوں سے دور رکھا جائے یہ منفی عمل ہو گا اور مثبت عمل یہ ہے کہ ان کے اندر اتحاد کی ضرورت واضح کرتے ہوئے اس کے لئے کوشش کرنے کا ذوق اور داعیہ پیدا کیا جائے۔ اور

نوجوانوں کو ان کاموں میں لگایا جائے جو ان کی تعمیری صلاحیتوں کو مثبت رخ دے سکے۔

دوسری طرف نوجوانوں کو منظم کیا جائے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ یہ طے کریں کہ وہ اپنے قول و عمل سے انتشار و افتراق کی آگ کو بھڑکنے نہ دیں گے اور اگر کوئی شخص مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، چاہے اس کا سیاسی قد کتنا ہی اونچا اور مذہبی حیثیت کتنی ہی مسلم ہو اس کی بات نہ سنیں گے اور نہ مانیں گے بلکہ اپنی بساط بھر اس کو ایسی بات کرنے یا ایسا کوئی قدم اٹھانے سے روکیں گے۔ کیونکہ موجودہ ماحول میں مسلمانوں میں انتشار کی بات کرنا نفاق سے کم نہیں ہے۔ قرآن کا واضح اعلان ہے :

جب ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انہوں نے یہی کہا، ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے(ال ۱۲-۱۱)

لہٰذا موجودہ صورتحال میں ملت میں انتشار پیدا کرنے والا دو حیثیتوں سے خالی نہیں ہے ایک طرف جبکہ فسطائی عناصر نے ملت پر چاروں طرف سے حملہ بول دیا ہے اور ملت اندرونی محاذ پر بنیادی طور پر کمزور ہے (Structurally weak) ہے اس صورت میں انتشار ملت کو ہوا دینے والا یا تو بالکل ناداں ہے اور ظاہر ہے نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے یا پھر اس کے دل میں نفاق کا روگ لگا ہوا ہے وہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں بکا ہوا ہے لہٰذا ہر دو صورتوں میں وہ ناقابل اعتبار ہے۔ ایسے کسی شخص کی پذیرائی اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کو دعوت دے کر گھر لانا ہے۔ جو کسی طرح

صحیح نہیں ہے۔ فاعتبروا یااولی الابصار۔

مسلمانوں کی زبوں حالی کی مندرجہ بالا دینی، اخلاقی اور سماجی وجوہات کے ساتھ ساتھ تین ایسی بنیادی مادی وجوہات ہیں جن پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے :

(۱) تعلیم کی کمی

(۲) معاشی بدحالی

(۳) قیادت کا فقدان

تعلیم کی کمی :اگر مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کی کوئی ایک وجہ ہو سکتی ہے تو وہ تعلیمی پسماندگی ہے تمام علماء، زعماء، ماہرین، سیاسی لیڈران اور خود حکومت کا یہ اعتراف ہے کہ مسلمان اس ملک کی سب سے پس ماندہ ترین آبادی ہیں ان کی پس ماندگی کی سب سے بڑی وجہ تعلیمی پس ماندگی ہے مختلف سروے، رپورٹوں اور مطالعات سے بھی اس کی تصدیق ہوئی ہے۔ دراصل آزادی کے پچھلے پچاس سالوں میں ایک طرف فسادات وامتیازات سرکاری اسکیموں کے نفاذ میں کرپشن، کاہلی، تعصب اور ڈنڈی ماری، دوسری طرف غربت اور شعور کی کمی اور مسلمان قیادت کا انتشار ناواقفیت، عدم توجہی اور ابن الوقتی نے حالات کو ناگفتہ بہہ بنادیا ہے۔ آج جو آبادیاں علاقے اور اضلاع غالب مسلم آبادی والے ہیں جہاں مسلمان کی معتدبہ تعداد ہے وہ سب کے سب پلاننگ کمیشن، اچ آر ڈی منسٹری اور ہوم منسٹری کے رپورٹ کے مطابق حد درجہ تعلیمی اور معاشی پس ماندگی کے شکار ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پس ماندگی کا پورا نٹ ورک ہے جو ملت کو آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ اس لئے جب تک جہالت کے اس محاذ پر براہ راست حملہ

کر کے اس کے حصار کو توڑا نہیں جاتا ہم ملی بہتری کی کوئی امید نہیں کر سکتے۔ لہذا اس پر سب سے پہلے اور بھر پور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں میں تعلیمی پس ماندگی ہر جگہ اور ہر سطح پر ہے۔ مسلمانوں میں تعلیم کمیت (Quantity) اور کیفیت (Quality) ہر دو اعتبار سے کم ہے۔ اس لئے تعلیمی پس ماندگی ملی پس ماندگی کی علت بھی ہے اور معلول بھی۔

مسلمانوں کے تعلیمی اور معاشی مسائل پر گفتگو کرنے میں سب سے بڑی روکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے پاس اس سلسلہ میں ضروری اعداد شمار کی کمی ہے۔ حکومت ہند کے پاس ایسے کئی ادارے ہیں بالخصوص مردم شماری کا ادارہ جو تمام ضروری معلومات جمع کرتا ہے لیکن حکومت بعض سیاسی مصالح کی بنا پر مسلمانوں کے سلسلہ میں ان اعداد شمار کو شائع کرنے سے گریز کرتی ہے۔ مسلم دانش وران اور قائدین اس سلسلہ میں مسلسل مانگ کرتے رہے ہیں لیکن ابھی تک اس کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ حالات اتنے سنگین ہیں کہ اگر حکومت ان کو شائع کر دے تو ایک تو اس کی بدنامی ہوگی دوسرے اس پر دباؤ بڑھے گا۔ آج جبکہ معلومات کے حق کو بنیادی حق کے طور پر تسلیم کرنے کی بات کی جارہی ہے اور ملک کے قائدین اس کی وکالت بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو ان کے ہی بارے میں مانگنے پر بھی جانکاری نہیں دی جارہی ہے۔ جبکہ شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کے بارے میں پورے اعداد شمار شائع کئے جاتے ہیں اور اس کی بنیاد پر ان کو آگے بڑھانے اور ترقی کے مواقع فراہم کرنے کی مختلف اسکیمیں بنائی جاتی ہیں۔ حکومت مسلمانوں کو کس نظر سے دیکھتی ہے اور ان کو کتنی اہمیت دیتی ہے۔ اس کا اندازہ اس کی اس بے رخی سے اچھی طرح کیا جاسکتا ہے۔

جب لوگوں نے بہت زور ڈالا اور مسلمانوں کے حالات زار کی طرف توجہ دلائی تو پہلی بار اندرا گاندھی نے گوپال سنگھ کی قیادت میں ہوم منسٹری کے زیر اہتمام مسلمانوں کے حالات جاننے کے لئے ایک مطالعاتی گروپ تشکیل دی جس نے ۱۹۸۳ میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں مسلمانوں کی حالت زار کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس نے مسلمانوں کے اس احساس کو پختہ کر دیا کہ پچھلے پچاس سال میں ان کو ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہریجنوں اور دیگر پس ماندہ ذاتوں سے بھی پیچھے کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ گوپال سنگھ رپورٹ میں یہ اعتراف موجود ہے کہ مسلمان اس ملک کی سب سے پس ماندہ ترین آبادی ہیں یہاں تک کہ وہ نیوبودھسٹ جو اس ملک کا سب سے چھوٹا گروہ ہے اس سے بھی پیچھے ہیں۔

اس رپورٹ کی اشاعت نے حکومت کو بھی اور خود مسلمان دانشوروں اور علماء کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پھر اس کے بعد بہت سارے اداروں نے مختلف سطحوں پر مختلف مطالعاتی گروپ تشکیل دے کر چھوٹے چھوٹے علاقائی سروے کروائے ہیں۔ جن تمام کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان چاہے بہار اور یوپی کا ہو، یا آسام اور بنگال کا، تامل ناڈو اور کیرالہ کا ہو یا کرناٹک اور اندھرا پردیس کا سب جگہ وہ پس ماندگی کا شکار ہیں۔ میں ان رپورٹوں سے حاصل شدہ کچھ اعداد شمار آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں تاکہ آپ خود اندازہ کرلیں کہ صورتحال کس حد تک خراب ہو چکی ہے۔

پروفیسر گوپال کرشنا (۱۹۸۲) نے ۱۴ ریاستوں اور علاقہ زیر مرکز دہلی کے ۳۵ اضلاع میں مسلمانوں کی سماجی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اپنے

سیمپل (مطالعاتی نمونہ) میں ۲۹۹۵ مسلمان مردوں اور ۷۹۹ غیر مسلم مردوں کو رینڈم طریقہ سے چنا ہے۔ اس طرح اچانک حاصل شدہ معلومات سے جو نقشہ ابھر کر سامنے آتا ہے وہ مندرجہ ذیل ٹیبل (جدول) سے ظاہر ہے

ٹیبل۔۱ پوچھے گئے مسلم اور غیر مسلم لوگوں کی تعلیمی صلاحیت

	ناخواندہ سے پرائمری تعلیم تک	ہائی اسکول تک	کالج اور تکنیکی تعلیم	یونیورسٹی اور اعلیٰ تکنیکی تعلیم
مسلمان	55.4	40.8	2.8	1.1
غیر مسلم	29.8	55.0	11.0	4.2

ذریعہ : گوپال شرشنا(1982)

اس ٹیبل سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں ناخواندگی کی شرح 55.4% ہے جبکہ غیر مسلموں میں صرف 29.8% ٹھیک اسی طرح مسلمانوں میں ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد 40.8% ہے جبکہ غیر مسلموں میں 55.0% کالج اور تکنیکی تعلیم مسلمانوں میں 2.8% جبکہ غیر مسلموں میں 11.0% اور اعلیٰ تعلیم کی شرح مسلمانوں میں صرف 1.1% جبکہ غیر مسلموں میں 4.2%۔ یہ مطالعہ محض علامتی ہے۔ کیونکہ اولاً تو مسلمانوں کی تعداد اس سیمپل میں زیادہ ہے اور غیر مسلموں کی تعداد کم ہے۔ اس سیمپل میں ۱۴ ریاستوں اور دہلی کو شامل کیا گیا ہے جہاں نسبتاً پڑھے لکھے لوگ دور دراز کے دیہی آبادی کے مقابلے زیادہ ہیں۔ اس میں خواتین اور مسلمانوں کی دیگر پس ماندہ برادریوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لئے اگر پورا ہندوستان لیا جائے۔ شہر اور دیہات دونوں کو شامل کیا جائے اور خواتین اور دیگر پس ماندہ برادریوں کو اس مطالعہ میں شامل کیا جائے تو صورتحال اس سے بدتر نظر آئے گی جیسا

اس مطالعہ میں ظاہر کیا گیا ہے :

حکومت ہند کی وزارت داخلہ نے 1983 میں تعلیمی اداروں اور مسلمان بچوں کے داخلہ کا ایک سروے کرایا ہے جو نیچے ایک ٹیبل کی شکل میں دیا جارہا ہے۔

ٹیبل۔۲ تعلیمی اداروں میں مسلمان بچوں کا داخلہ

(نوٹ : ٹیبل اگلے صفحہ پر)

اس ٹیبل سے واضح ہے کہ جن ریاستوں اور اضلاع اور اس میں پائی جانے والی مختلف سطحوں کے تعلیمی اداروں کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے ہر ادارے اور سطح پر ان ریاستوں اور اضلاع میں پائی جانے والی مسلمان آبادی کے تناسب سے کم مسلمان بچون کا داخلہ ہوتا ہے۔ جب داخلہ ہی کم ہوگا تو پاس کرنے والے لوگوں کی تعداد کم ہوگی۔

گوپال سنگھ پینل نے اپنے رپورٹ میں ایک بات بہت کھل کر کہی ہے کہ ان کی (مسلمانوں کی) تعلیمی کامیابی عام طور پر بہت کم ہے ان کے یہاں اسکول چھوڑنے والوں (Dropout) کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور کامیاب ہونے والے طلبا کی تعداد بہت کم ہے اور یہ صورتحال ملک کے ہر حصہ اور ہر سطح کی تعلیم میں بغیر کسی استثناء کے پائی جاتی ہے۔ لہذا گوپال سنگھ کے مطابق ایک تو مسلمان داخلہ ہی کم کراتے ہیں اور جن لوگوں کا داخلہ ہوتا ہے ان میں ستر فیصد طالب علم پرائمری درجات میں ہی اسکول چھوڑ جاتے ہیں۔ مسلمان طالب علموں کی بہت کم تعداد اعلیٰ تعلیم کے اداروں تک جاپاتی ہے۔

حکومت ہند کی وزارت فروغ انسانی وسائل نے ملک کے 417 اضلاع کا تعلیمی زائچہ تیار کیا ہے۔ جس میں کل تعلیم کی شرح عورتوں کی تعلیم کی شرح،

ٹیبل-II تعلیمی اداروں میں مسلمان بچوں کا داخلہ

درجات	سروے کئے گئے اضلاع کی تعداد	ضلع میں مسلمان آبادی کا تناسب	مسلمان بچوں کا تناسب	تعلیمی اشاریہ
بنیادی اسکول	۱۲/ ریاستوں کے ۴۵ اضلاع میں	17.32	12.39	0.72
سکنڈری اسکلو	۱۱/ ریاستوں کے ۳۸ اضلاع میں	18.56	10.70	0.58
ہائی اسکول	۸ بورڈوں میں	12.00	4.00	0.33
کلاس XII	۵ بورڈوں میں	10.30	2.49	0.24
انجینرنگ	۹ یونیورسیٹی	12.44	3.41	0.27
میڈیکل	۲۱ میڈیکل کالج	9.55	2.44	0.36

ذریعہ : اقلیتی رپورٹ، وزارت داخلہ حکومت ہند۔1983

پرائمری درجات میں کل داخلے کی شرح، اور پرائمری درجات میں لڑکیوں کے داخلے کی شرح کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جو ضلع تعلیمی لحاظ سے جتنا پس ماندہ ہے اس کو اس فہرست میں اتنی ہی اوپر جگہ دی گئی ہے۔ اس زائچہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جن اضلاع میں مسلمانوں کی آبادی نسبتاً زیادہ ہے وہ تعلیمی لحاظ سے زیادہ پس ماندہ ہیں۔ اس فہرست میں ملک کے 42 پس ماندہ ترین اضلاع میں مغربی چمپارن، سہرسہ، پوربی چمپارن، پورنیہ، سیتامڑھی، گوپال گنج، مدھوبنی، ملک کے پس ماندہ ترین اضلاع میں شمار میں کئے گئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی اور پس ماندگی کے تناسب میں سیدھا رشتہ ہے۔

یہ بالکل ریڈم سروے اور آدھی ادھوری معلومات پر مبنی جائزہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ صورتحال کتنی سنگین ہے۔ جس طرح ہانڈی کے ایک چاول کو دیکھ کر پتہ لگ جاتا ہے کہ چاول پک چکا ہے یا نہیں اس طرح ریندم سیمپل سروے یا مختصر مقامی جائزے سے بھی صورتحال کا عمومی اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس لئے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر چاہے وہ ملکی سطح پر حاصل کئے گئے ہوں یا مقامی سطح پر ان کے اعداد شمار کا تجزیہ کرنے سے صاف صاف اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان تعلیمی محرومی کے شکار ہیں اور وہ موجودہ تعلیمی ترقی کے مواقع سے ٹھیک طور پر فائدہ نہیں اٹھا پا رہے ہیں۔ خاص طور سے لڑکیوں کی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے میدان ہی مسلمان بہت پیچھے ہیں۔ نہ صرف غیر مسلم اور سرکاری اداروں ہیں مسلمانوں کا داخلہ بہت کم ہے بلکہ خود مسلمانوں کے ذریعہ چلائے جانے والے اداروں میں مسلمان طلباء بالخصوص طالبات کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ خاص طور سے اونچے کلاسز میں۔

تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بالعموم امتحانات میں مسلمانوں کی کامیابی کی شرح اور معیار غیر مسلم طالب علموں کے مقابلے کم ہوتی ہے۔

یہ مختصر جائزہ اس بات کو پوری طرح ثابت کرتا ہے کہ سرکاری اور قابل وثوق ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بالعموم اور بہار کے مسلمان بالخصوص تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق ملک میں عام تعلیم کا اوسط 62%اور بہار میں 39% ہے جبکہ مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب صرف 25%۔ مسلمان مردوں میں تعلیم 16% ہے اور خواتین میں 9% گویا 84% مرد اور 91% خواتین جہالت کے اندھیرے میں جی رہے ہیں یہ صورتحال کتنی بھیانک ہے اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جدید ترقیات میں سے کوئی خاص حصہ نہیں مل رہا ہے بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی محرومی اور مسائل بڑھتے جارہے ہیں۔ تعلیم، معاش، سرکاری نوکری، تجارت، معیشت، اسکول، کالج، یونیورسیٹی اور دیگر اداروں میں ان کی نمائندگی صفر سے کچھ زائد ہے۔ آزادی کے وقت سرکاری دفاتر میں مسلمان افسروں اور کارندوں کی تعداد 34% تھی جو اب گھٹ کر 3-4% رہ گئی ہے۔ کلاس ون سروسز میں ان کا تناسب صرف 1% ہے۔ یہی حال دیگر شعبوں اور اداروں کا ہے۔

لہذا مسلمانوں کی بہتری کی کوئی اسکیم تعلیمی میدان میں ان کی ترقی کے بغیر ناقص اور نامکمل رہے گی۔ اس لئے میرے خیال میں تمام مسلمان دانشوروں، علماء اور عام مسلمانوں میں تعلیم کے پھیلاؤ پر پوری توجہ صرف کرنی چاہئے۔ یہ کام محض تعلیم

کی اہمیت اور ضرورت پر پر زور اور مدلل گفتگو کے ذریعہ پورا نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے ٹھوس منصوبہ بندی، واضح حکمت عملی اور پر زور کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں کے اندر تعلیم سے محرومی کے بڑے اسباب ہیں۔ سب سے بڑی وجہ غربت ہے۔ چونکہ مسلمان عوام کی غالب اکثریت ایک اندازے کے مطابق 70% غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذار رہی ہے۔ اس لئے تعلیم اس طبقہ کے لئے ایک سامان تعیش سے کم نہیں ہے۔ اس لئے اس طبقہ کی بڑی آبادی کے بچے کبھی کسی اسکول میں داخل نہیں ہوتے ہیں اور اگر ان کا داخلہ ہوتا بھی ہے تو 88% بچے پہلے دوسرے درجے میں ہی اسکول چھوڑ جاتے ہیں۔

تعلیم سے محرومی کی دوسری وجہ شعور کی کمی ہے۔ غربت اور جہالت آدمی کو بے شعور کاہل اور قسمت پرست بنادیتی ہے۔ وہ وقتی اور معمولی فائدے کو دیرپا اور بڑے فائدے پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ عام طور پر غریب والدین اپنے چھوٹے بچوں کو ایک تو اسکول میں داخلہ نہیں کراتے اور اگر کراتے بھی ہیں تو بہت جلدی اسکول سے ان کو اٹھالیتے ہیں اور ان کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگادیتے ہیں جن سے ان کو یومیہ یا ماہانہ تھوڑی رقم مل جاتی ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوگا جب تک ہم ان کے سامنے معاش کی کوئی ایسی متبادل اسکیم اور بچوں کی کفالت کا کوئی ایسا نظم نہ پیش کریں جو والدین کو تعلیم کے لئے بچوں کو فارغ کرنے کے لئے آمادہ کردے۔ اس کام کے لئے علماء ودانشوروں، سیاسی کارکنوں، مختلف سوشل گروپ اور حکومت کو مل جل کر کام کرنا ہوگا۔ ورنہ صدفی صد تعلیم کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا ہے۔

تعلیمی پس ماندگی کی تیسری وجہ مسلمانوں میں اس کام کے لئے سوشل ایکشن کی کمی ہے۔ ہم نے دینی امور کی بجاآوری کے لئے جماعتیں اور ادارے بنائے ہیں اور اس کام کے لئے ہمارے اندر کئی طرح کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ مثلاً شرعی امور کی بجاآوری کے لئے امارت شرعیہ اور ادارۂ شرعیہ، امارت اہل حدیث کا قیام عمل میں آیا ہے۔ مسلمانوں میں دینی اجتماعیت کے قیام اور دین کی اقامت وشہادت کے لئے جماعت اسلامی کوشش کررہی ہے۔ کلمہ اور نماز کی تبلیغ کے لئے تبلیغی جماعت سرگرم عمل ہے۔ لیکن تعلیم کو عام کرنے کے لئے ہمارے پاس ایسی کوئی تحریک اور ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ تبلیغی جماعت کے طرز پر ایک تعلیمی تحریک چلائی جائے جو شہر اور دیہات کی محروم آبادیوں میں گھوم گھوم کر تعلیم کی تبلیغ کرے اور بچوں اور عورتوں کی تعلیم کا مناسب نظم کرے۔

مسلمانوں میں تعلیمی پس ماندگی کی چوتھی وجہ حکومت کی سوچ اور اس کے تعلیمی مشنری کی کوتاہی ہے مسلمان عوام سے عدم ہمدردی بلکہ فرقہ پرستی ہے۔ دستور ہند کے دفعہ 45 میں رہنما اصول کے تحت ۱۴ سال تک کہ تمام بچوں کی مفت اور لازمی تعلیم کی بات کہی گئی ہے۔ اور اس کے لئے دس سال کے اندر بچوں کی حد تک مکمل خواندگی کی شرح حاصل کرلینے کا منصوبہ رکھا گیا تھا لیکن آزادی کے پچاس سال سے زائد گذرنے کے بعد بھی جبکہ ہم اب اکیسوی صدی میں داخل ہوگئے ہیں یہ مقصد ہم سے ابھی کوسوں دور ہے حال کے دنوں میں تعلیم کے حق کو بنیادی حقوق میں شامل کرنے کی بات کی جارہی ہے لیکن صورتحال پر اس سے کتنا فرق پڑے گا یہ کہنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ اس ملک میں بنیادی حقوق کی جس طرح کھلے عام پوری بے

دردی اور بے شرمی سے پامالی ہورہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس طرح کے نمائشی عمل (Cosmetic exercise) کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دراصل ہندوستان جیسے پیچیدہ اور کثیر المذہبی اور کثیر اللسانی ملک میں تمام طبقوں، فرقوں اور زبانوں کے حاملین کی تعلیم ایک نازک اور پیچیدہ عمل ہے جس کو تمام طبقوں کے جذبات اور ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر پوری ہوشیاری اور احتیاط سے انجام دینے کی ضرورت ہے۔ اس میں تہذیبی جارحیت کا کوئی عنصر اگر شامل کردیا جائے تو صورتحال بہتر ہونے کے بجائے خراب ہوگی۔ یہ چیز جہاں مختلف طبقات اور گروہوں کو پیچھے چھوڑ دیگی وہی ملک کو بھی نقصان پہنچائے گی۔

آزادی کے بعد حکومت ہند نے بالخصوص اتر بھارت کی ریاستوں نے جیسے یوپی، بہار، دہلی، راجستھان نے جو تعلیمی اور معاشی پالیسی اپنائی وہ مسلمانوں کے لئے نقصان پہنچانے والی تھیں یہ پالیسی کسی غلط فہمی اور ناواقفیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنائی گئیں اور جب مسلمانوں نے اس جانب توجہ دلائی تو اسے سختی سے نظر انداز کرتے ہوئے انہیں یہ باور کرایا گیا کہ اب ملک کا نظام اسی اصول کی بنیاد پر چلے گا۔ اردو کو دیس نکالا دینا، نصاب میں دیومالائی تصورات بھرنا اور پوری مسلم عہد کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا یہ چند ایسی چیزیں تھیں جس نے مسلمانوں کے ذہنوں میں زبردست شبہات پیدا کئے۔ چنانچہ مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری اداروں میں داخل کرانے سے کترانے لگے۔ کمیونیٹی کے پاس اتنی بڑی آبادی کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کا چونکہ کوئی نظم نہیں تھا اس لئے ان کے اندر جہالت کا تناسب بڑھا۔ دوسرے مسلمان آبادیوں کو اسکولوں سے محروم رکھا گیا۔ ملک میں

تعلیم کے پھیلاؤ کی جو بھی کوشش کی گئی اس میں مسلمانوں کو شامل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ بلکہ ان کو اس سے الگ تھلگ رکھا گیا۔ نتیجہ ہے کہ مسلمان دن بدن تعلیم کے میدان میں پچھڑتے چلے گئے۔ یہ سب اس وقت ہوا جبکہ ملک میں مرکز اور ریاستوں میں نام نہاد سیکولر کہی جانے والی کانگریس حکومت برسر اقتدار تھی۔ اب جب سے ہندو فسطائی عناصر کو مرکز اور ریاست میں اقتدار حاصل کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ انہوں نے صورتحال کو اور بھی ناقابل برداشت بنادیا ہے۔ حال کے دنوں میں یوپی کے اسکولوں میں وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کو لازمی قرار دیدیا گیا تھا اور تمام بچوں کی طرح مسلمان بچون کو بھی اس کا پابند کیا گیا۔ اس پر پوری ریاست میں زبردست احتجاج ہوا اور مرحوم علی میاں صاحب جیسے صلح کل پر یقین رکھنے والے دینی رہنما نے بھی مسلمان بچوں کو ایسے تمام اسکولوں سے اٹھا لینے کی دھمکی دی۔ ابھی تک معاملہ ختم نہیں ہوا ہے۔

موجودہ صورتحال 1857 میں غدر کے بعد کی صورتحال سے بڑی حد تک مماثل ہے۔ پروفیسر محمد سلیم کے مطابق غدر سے پہلے مسلمانوں میں 85% تعلیم تھی۔ جب انگریز آئے اور انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھین لی اور فارسی رسم الخط کو بدل کر انگریزی نظام تعلیم رائج کردیا تو مسلمانوں نے ایک تو انگریزی اقتدار سے نفرت کی وجہ سے اور دوسرے اس اندیشے سے کہ تعلیم کے ذریعہ کہیں یہ ان کا دین نہ بدل دیں اپنے آپ کو جدید تعلیم سے دور رکھا اور وہ قوم جس میں قریب قریب صد فی صد تعلیم تھی قریب قریب صد فی صد جہالت کی اندھی کھائی میں جارہی۔ جب سرسید نے علی گڑھ تحریک کی شروعات کی اس وقت ان کا احساس تھا کہ مسلمان اپنے

برادران وطن سے جدید تعلیم کے میدان میں سو سال پیچھے ہیں کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد اور 1757 میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کی پلاسی کے میدان میں شکست کے بعد ہی برادران وطن بالخصوص بنگالی ہندوؤں نے انگریزوں کی نافذ کردہ جدید تعلیم کو اختیار کر لیا تھا اور ان کے کارندے بن کر ان کی حکومت اور تجارت کو فروغ دینے میں پوری وفاداری اور جانثاری سے لگ گئے تھے۔ دھیرے دھیرے انہوں نے برہمنوں، کائستھوں اور اعلیٰ ذات کے دیگر ہندوؤں کو اپنا ہم خیال بنالیا اور بنگال سے بنارس پھر اودھ دہلی اور پورے اتر اور دکھن بھارت میں انگریزی تعلیم کا بول بالا ہو گیا۔ جبکہ مسلمان ان تمام تبدیلیوں سے قطع نظر چھوٹے چھوٹے مدارس اور مکاتب کھول کر اپنے بچوں کی دین و زبان کی حفاظت میں لگ گئے۔ آج صورتحال اس سے بھی نازک اس لئے ہے کہ ہندو فسطائی عناصر نے مسلمان جماعتوں اور شخصیات کو ہی نہیں بلکہ مدارس، مکاتب اور مساجد کو بھی نشانہ بنالیا ہے اور اسے آئی۔ ایس۔ آئی کا اڈہ قرار دے کر ان کو ہراساں اور بدنام کر کے ان کے خلاف ملک میں ایسی مہم چلانا چاہتے ہیں تاکہ جہاں کہیں کوئی مسلمان داڑھی ٹوپی والا نظر آجائے یا کسی اسلامی جماعت کی سرگرمی میں حصہ لیتا ہوا معلوم ہو لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھیں کہ ہو نہ ہو یہ پاکستانی ایجنٹ اور ملک دشمن جاسوس ہو۔ ایسے لوگوں پر پولس کا ہاتھ ڈالنا آسان ہو جائے۔ ملکی پریس جس طرح اس سازش میں شریک ہے اس کا اندازہ آپ کسی ایک دن کا اخبار اٹھا کر کر سکتے ہیں۔ مسلمان اگر کوئی ادارہ کھولیں تو اسے بند کرانے کی سازش اور کوشش ہوتی ہے۔ اس صورتحال میں تعلیمی ترقی کیسے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو تعلیمی پس ماندگی میں مبتلا رکھنے میں خود حکومت جتنی ذمہ دار ہے اتنا کوئی اور نہیں۔ جب تک حکومت اور

انتظامیہ کی ذہنیت نہیں بدلتی اس صورتحال کی اصلاح مشکل ہے۔

ملک میں تہذیبی جارحیت کے روز افزوں بڑھتے قدم نے ایک بار پھر مسلمانوں میں ارتداد کا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو ملی مین اسٹریم سے دور ہے اور غربت و جہالت میں مبتلا ہے جن کے باپ دادا کبھی مسلمان ہو گئے لیکن ان کی کبھی کوئی اسلامی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی۔ جن کے اندر آج بھی ہندو رسم و رواج پائے جاتے ہیں بسا اوقات وہ اپنی جہالت اور اسلام سے قطعی ناواقفیت کی وجہ سے ہندو تہواروں وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں ان کو ورغلا پھسلا کر (گویا اسلام اور کفر کی سرحد پر کھڑے لوگ جن کو قرآن نے اعرابی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے) پھر سے ہندو بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ نٹ، بھیل، اور راجستھان کی بعض بنجارہ آبادیاں اس ضمن میں آتی ہیں۔ ایسے لوگ یوپی، بہار اور دیگر ریاستوں میں بھی ہیں بہر حال وہ لوگ مسلمان ہیں جن کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ بڑی آسانی سے ایک سچا اور اچھا مسلمان بنایا جاسکتا ہے۔ لہذا ملت کے ہوش مند طبقے کو اس جانب بھی توجہ دینی چاہئے۔

ہمیں ایک بات کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ تعلیم کے بغیر آج کی دنیا میں کسی قوم کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ لہذا اپنے تمام ملی ایجنڈے میں تعلیم کے فروغ کو اولین ترجیح دینی چاہئے۔ تعلیم کی یہ ترقی Horizontal اور Vertical دونوں ہونی چاہئے۔ آج کل لوگوں نے تجارتی مقاصد کے لئے بڑے بڑے ادارے کھول رکھے ہیں جن میں متمول اور صاحب ثروت گھرانوں کے بچوں کے لئے اچھے تعلیمی انتظامات ہیں۔ میں اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کرتا یا کسی تعصب اور تنگ نظری

کے باعث ان کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کہنا چاہتا۔ مگر محض اس طبقہ کی تعلیمی ضرورت پوری کر کے ہم ملت کی تعلیمی ضرورت پوری نہیں کر سکتے ہیں۔ ملت کی تعلیمی ضرورت تبھی پوری ہوگی جب ملت کے عام لوگوں کی تعلیم کا انتظام ہوگا۔ ہماری ملت میں نچلہ طبقہ اور متوسط طبقہ لگ بھگ 95% ہے۔ یہ طبقہ اپنے پاس اتنے وسائل نہیں رکھتا کہ بڑے اداروں میں اونچی فیس دے کر اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کر سکے۔ اور جب تک اس طبقہ کی تعلیمی ضرورت پوری نہیں ہوگی۔ ملت سے جہالت دور نہیں ہو سکتی ہے۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طبقہ کی آمدنی اور معاشی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی معیاری تعلیم کا نظم کیا جائے۔ یہ کام حکومت کی سطح پر بھی ہونا چاہئے اور ملی سطح پر بھی۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ہم یہ مان لیں کہ ملت نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی ہے۔ نہیں بلکہ بعض افراد اور اداروں نے اس سلسلہ میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اور شاندار مثالیں قائم کی ہیں۔ آج پورے ملک میں مدارس اسلامیہ کا جال پھیلا ہوا ہے جو ہر طرح کے سرکاری امداد و تعاون سے آزاد ہو کر غریب، یتیم، نادار، اپاہج اور نابینا بچوں کی پوری کفالت کے ساتھ تعلیم کا نظم کر رہے ہیں۔ جن میں بچوں کی رہائش، کھانے پینے، لباس پوشاک، کتاب کاپی اور دوا علاج سب کا نظم ہے۔ یہ ایک مکمل نظام ہے جس سے سالانہ لاکھوں بچے مستفید ہوتے ہیں۔ ضرورت ان کوششوں کو اور مربوط اور منظم کرنے کی ہے۔ ان کے ماحول کو صحت مند بنانے کی ہے۔ ان کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ہے۔ ان کے تعلیمی معیار کو بہتر اور عصری تقاضوں کے مطابق بنانے کی ہے۔

اس کے لئے ہمارے دانش وروں، ملی رہنماؤں اور قوم کے صاحب ثروت افراد کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی مناسب رہنمائی کی جا سکے اور ان کوششوں کو مہمیز دے کر ملت سے جہالت کا اندھیرا دور کیا جا سکے۔

اب تک یہ تمام کوشش کسی واضح منصوبے کے بغیر محض اللہ کے فضل و کرم سے چلائی جارہی ہیں جن کے لئے کوئی ٹھوس اور مستقل ذریعہ آمدنی نہیں ہے کچھ لوگ سخت مجاہدہ کر کے عوام سے چھوٹی، چھوٹی رقمیں حاصل کر کے بسا اوقات لوگوں کا سخت سست برداشت کر کے اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی کوشش اور ان کا اخلاص قابل صد ستائش ہے۔

ادھر بعض ریاستوں نے مدرسوں کو اپنی تحویل میں لے کر ان کے اساتذہ کو معاشی تحفظ اور ان کے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے اس قدم سے اساتذہ کی مالی حالت پہلے سے کچھ بہتر ہوئی ہے لیکن یہ اسکیم ہر دو محاذ پر ناکام ہے۔ اولاً تو اساتذہ کو سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کی طرح تنخواہیں نہیں ملتیں اور نہ ان کو وہ سہولتیں حاصل ہیں جو عام طور پر سرکاری کارندوں کو مل رہی ہیں اس لئے اساتذہ میں عدم اطمنان پایا جاتا ہے جو تعلیم کے نظام کو متاثر کر رہی ہے۔ دوسرے ان اداروں کا سرکاری کرن ہونے سے ہر طرح کی دھاندھلی اور کرپشن کا دار دورہ ہو گیا ہے جو لوگوں کے دین و دانش دونوں کو لوٹ رہے ہیں۔ اور ایسے مدرسے جہل و بد عنوانی کے اڈے بن گئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنا سارا دین و ایمان بیچ کر چند لقمہ تر حاصل کرنا زندگی کا سب سے بڑا نصب العین سمجھتے ہیں۔ اس ماحول میں وہ مدرسے جو اب تک سرکاری تحویل سے آزاد ہیں تعلیم و تربیت نیز تقویٰ اور دین داری کے لحاظ

سے غنیمت ہیں۔ اس لئے ان مدرسوں کی اصلاح و تعمیر اور ترقی و بہتری کی طرف دھیان دینا ہماری ملی تعلیمی اسکیم کا لازمی جزو ہونا چاہئے۔

تعلیم کے باب میں نچلے طبقے کی تعلیم، متوسط طبقے کی تعلیم، خواتین کی تعلیم، نوجوانوں اور بڑوں کی تعلیم، فنی اور سائنسی تعلیم، خود روزگار اور ویکیشنل تعلیم غرض ہمہ جہتی تعلیم کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک متعینہ (Time frame) اوقات میں صد فی صد تعلیم کے حصول کا ایک ملی منصوبہ بنانا چاہئے اور تمام جماعتوں، اداروں اور افراد کے ساتھ ساتھ حکومت، بین الاقوامی ایجنسیوں اور اداروں کے تعاون سے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ایک جانکاہ کوشش شروع کرنی چاہئے۔ تبھی ہم مہذب اقوام میں ایک باعزت مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے اپنی نوجوان قوت کا منصوبہ بند استعمال ایک لازمی قدم ہوگا۔

معاشی بدحالی : مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب میں ایک بڑی وجہ ان کی معاشی بدحالی بھی ہے۔ ہندوستان کی کل آبادی میں ہندو اقوام 82% ہیں جبکہ 12% مسلمان، 2.5% سکھ، بودھ 07% ان کے علاوہ پارسی، یہودی اور چند دیگر بہت چھوٹی چھوٹی اقلیتیں ہیں۔

دنیا میں قریب قریب ہر جگہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ عام طور پر اقلیتیں اکثریت کے مقابلے زیادہ خوشحال اور فارغ البال ہوتی ہیں۔ امریکہ میں یہودی ایک چھوٹی اقلیت ہیں پچیس تیس کروڑ کی آبادی میں محض ۲۵-۳۰ لاکھ لیکن وہ امریکہ کی سب سے موثر اور خوشحال آبادی ہے۔ تجارت، معیشت، بنک، یونیورسیٹی، ریسرچ سنٹر اور ذرائع ابلاغ پر ان کا ایسا زبردست قبضہ ہے کہ امریکہ کا کوئی صدر خواہ وہ کتنا ہی

طاقت ور ہو ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ یورپین ممالک میں ایشیائی نسل کے لوگ جتنے خوشحال ہیں وہاں کی مقامی آبادی اتنی خوشحال نہیں ہے۔ دور کیوں جایئے، ہندوستان میں پارسی اور جین بہت چھوٹی آبادی ہونے کے باوجود زبردست معاشی اثر و رسوخ رکھتے ہیں یہاں تک کہ عیسائی، سکھ اور بودھ جو مسلمانوں کے مقابلے بہت چھوٹی اقلیت ہیں معاشی اور تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں سے بہت آگے ہیں۔ ہندوستان کی قومی زندگی میں ان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ تجارت، معیشت، تعلیم، سرکاری عہدے اور دیگر میدانوں میں ان کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔ جو اس دعوی (Thesis) کی تصدیق کرتی ہے کہ اقلیت ہمیشہ اکثریت سے بہتر معاشی پوزیشن میں ہوتی ہے۔ اس میں دنیا بھر میں صرف ایک استثنیٰ ہے اور وہ ہندوستانی مسلمان ہیں جو اکثریت سے زندگی کے ہر میدان میں پیچھے ہیں۔ یہ بات محض تاثر کی بنیاد پر نہیں کہی جارہی ہے بلکہ اب تک جو مطالعات سامنے آئے ہیں وہ اس امر کی تصدیق کرتے ہیں لہذا مختلف اشارات (Indi-cators) کی بنیاد پر اس بات کو زیادہ بہتر طور پر متحقق کیا جاسکتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں

ہر قوم میں خواص (Elite) کی آبادی اس کی بہتر معاشی حیثیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف ایکونومک گروتھ بمبئی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اس نو لکھا کے ایک مطالعہ کے مطابق جو 1971 کی مردم شماری کی بنیاد پر کئے گئے ہیں جس کی اشاعت 1983 میں ہوئی ہے، ہندؤں کی آبادی کا تناسب 82.7% ہے جبکہ خواص کی ایک سو آبادی میں ہندو خواص 85.3% یعنی اپنی آبادی کے تناسب سے تھوڑا زیادہ ہیں۔ عیسائیوں کی آبادی 2.6% جبکہ ان میں خواص کی آبادی 3.5% ہے۔ سکھ

1.9% جبکہ ان میں خواص 3.6% یعنی اپنی آبادی سے دوگنی، جین صرف 0.5% جبکہ ان میں خواص 2.8% یعنی پانچ گنے سے بھی زیادہ ہیں۔ جبکہ مسلمان 11.2% اور ان میں خواص کا تناسب آدھے سے بھی کم یعنی 4.5% ہے ماہر سماجیات ڈاکٹر گوپال کرشنا کے ایک مطالعہ کے مطبق 57.1% مسلمان 250 روپے یا اس سے کم آمدنی والے خانے میں آتے ہیں جبکہ 29.7%، 251-700 اور صرف 13.2% 700 روپے سے زیادہ آمدنی والے خانے میں آتے ہیں۔ جبکہ غیر مسلموں میں یہ اوسط 44.9% اور 29.6% ہے۔

گوپال کرشنا نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ان کے پیشہ ورانہ خصوصیات کے لحاظ سے پانچ خانوں میں بانٹا ہے جس کے مطابق 32.3% مسلمان نچلے درجے کے پیشوں میں 30.8% نچلے متوسط اور 21.6% متوسط اور 17.6% اعلیٰ پیشوں میں ہیں اور صرف 0.7% اونچے درجات کے پیشوں میں ہیں جبکہ غیر مسلموں میں یہ اوسط علی الترتیب 23.1%، 33.2%، 11.9%، 27.9% اور 4.4% ہے۔

تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا ایک عمومی اندازہ آپ کو اوپر کے جائزے سے مل گیا ہوگا۔ تعلیمی ترقی اور معاشی بہتری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لہذا اگر تعلیمی پس ماندگی ہوئی تو اس سے معاشی پس ماندگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی کا ایک بڑا سبب ان کی تعلیمی پس ماندگی بھی ہے۔

تعلیمی پسماندگی کے باعث مسلمان ہر طرح کی نوکریوں میں سب سے پیچھے ہیں۔ مائنوریٹی کمیشن نئی دہلی کے ایک سروے کے مطابق سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ذیل کے دو جدول (Table) سے ظاہر ہیں :

(نوٹ : ٹیبل اگلے صفحہ پر)

معاش کے عام طور پر تین ذرائع ہیں تجارت، زراعت اور خدمات۔ مسلمان بنیادی طور پر صناع اور تاجر رہے ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں بعض قسم کے تجارت اور صناعی میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس میں بھی گھن لگ گیا۔ کسی زمانے میں مسلمان ہتھ کرگھا، پارچہ بافی، چمڑہ، چوڑی، مرادابادی برتن، تالہ، بنارسی ساڑی اور کشیدہ کاری وغیرہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور ان تجارتوں میں ان کو اجارہ دارانہ حیثیت حاصل تھی۔ لیکن ایک تو بدلتے وقت کے تقاضوں کے مطابق ہم آہنگ نہ ہونے کے سبب، دوسرے کچے مال اور مالیات کی عدم فراہمی، بازار کی کمی، سرکار کی سرد مہری اور عدم تعاون کی پالیسی، مسابقت کا فروغ اور فسادات نے مسلمانوں کے ہاتھوں سے بہت سارے کاروبار یا تو بالکل چھن گئے ہیں یا پھر ان کو ادھ مرا بنا دیا گیا نتیجے کے طور پر ان کاروبار میں لگے لوگوں کی مالی حالت دن بدن خراب ہونے لگی اور پہلے جو مالک ہوا کرتے تھے اب محض مزدور ہو گئے ہیں۔ ان کی محنت کی ساری کمائی یا تو بچولئے کھا جاتے ہیں یا پھر بڑے تاجر اور مہاجن۔ ان کے حصے میں بہت تھوڑا آتا ہے جو ان کی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہے۔

مسلمان کبھی زراعت پیشہ قوم نہیں رہے۔ کسی زمانے میں ان کے پاس بڑی بڑی جاگیریں اور زمینداریاں ہوا کرتی تھیں جو ملک کی سیاست میں تبدیلی کے سبب ختم ہو گئیں۔ اب ان کے پاس جوت کی چھوٹی چھوٹی زمیں ہیں جن سے مشکل سے ان کا گزر اوقات ہو پاتا ہے۔ ایک حالیہ **نیشنل سیمپل سروے کے مطابق ایسے مسلمان**

ٹیبل-I

عہدوں کا نام	سال / اداروں کی تعداد	کل بحالی	مسلمانوں کی تعداد	تناسب
آئی اے ایس	سال 1981 میں کل	3,883	116	2.99
آئی پی ایس	ایضاً	1753	50	2.85
انکم ٹیکس-I	1971-80 کے درمیان	881	27	3.06
ریلوے ٹریفک اور اکاؤنٹس	ایضاً	415	11	2.65
بنک	1317 برانچوں میں	113772	2479	2.18
مرکزی حکومت کے دفاتر میں	13 ریاستوں کے 105 دفاتر میں	75951	3346	4.41
ریاستی حکومت کے دفاتر	13 ریاستوں کی 876 دفاتر میں	826669	49718	6.01
مرکز اور ریاست کے سرکاری کارخانوں میں	13 ریاستوں کی 163 کارخانوں میں	776972	51755	10.85
کل		1581296	107492	6.80

0.5% ہیں جن کے پاس دس ایکڑ یا اس سے زائد اراضی ہے گاؤں میں رہنے والے 80% مسلمان بے زمین اور کھیتی ہر مزدور ہیں یا مختلف چھوٹے پیشہ جاتی کاموں میں لگے ہوئے ہیں یا آس پاس کی آبادی میں یومیہ مزدوری پر کوئی کام کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب جاہل ہیں اور غریبی کی سطح سے نیچے ہیں۔

لہذا یہ مختصر جائزہ کسی کو بھی اس بات سے مطمئن کر سکتا ہے کہ مسلمان معاشی لحاظ سے بہت پس ماندہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں کی موجودہ معاشی پس ماندگی کے مندرجہ ذیل موٹے وجوہات ہیں :

(۱) تاریخی عوامل : مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی کی تاریخ دو صدیوں پر محیط ہے۔ انگریز جس وقت ہندوستان میں آئے اس وقت اگرچہ مغلوں کا مرکزی اقتدار کمزور ہو چکا تھا اور مراٹھا، سکھ اور جاٹ مختلف علاقوں میں غالب آگئے تھے پھر بھی ہندوستان کے اتر دکھن پورب پچھم پر مختلف علاقوں میں مسلمان حکمراں تھے چنانچہ بنگال، اودھ، میسور دہلی اور حیدرآباد میں مسلمان حکومتیں تھیں۔ 1857 کے غدر میں مسلمان ہی اس کے ہراول دستہ تھے چنانچہ انگریزوں نے جب دلی کے تخت پر قبضہ کرلیا تو انہوں نے مسلمانوں کو باغی نمبر ایک جانا اور ان کا حوصلہ توڑنے کے لئے ظلم کی تمام سابقہ روایات کو توڑ دیا۔ مسلمان عوام تو پہلے سے غریب تھے۔ لیکن جو مسلمان خواص تھے جن کی بڑی بڑی جاگیریں تھیں ان سے چھین لیں اور ان کو در در کا بھکاری بنادیا۔ مسلمان جو مختلف قسم کی صنعت و حرفت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ان کے خلاف ایسی پالیسی بنائی جس سے ان کی صنعت و تجارت ماند پڑ گئی اور

ٹیبل-II

نوکری کا عہدہ	کلاس ون / ایگزیکیٹو	(ٹیکنیکل)	کلاس-III	کلاس-IV
مرکزی حکومت	1.61	3.00	4.41	5.12
ریاستی حکومت	3.30	4.48	4.62	5.35
مرکز اور ریاستوں کے سرکاری انڈرٹیکنگ میں	3.19	4.30	12.14	10.46

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ معدوم ہوتے چلے گئے۔ تعلیم کا ایک ایسا نظام اختیار کیا جس سے مسلمانوں کو اندیشہ لاحق ہو گیا کہ یہ ان کے دین و ایمان پر حملہ ہے اس لئے مسلمان اس تعلیمی نظام سے از خود دور ہو گئے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کا اپنا دشمن سمجھ کر ان کے لئے سرکاری نوکریوں کے دروازے بند کر دیئے۔ گویا معاشی ترقی کے جتنے ذرائع اور مواقع ہو سکتے تھے وہ سب ختم ہو گئے لہذا مسلمان یکایک معاشی اقبال مندی کی اونچی پہاڑی سے غربت کی کھائی میں جا گرے۔ انگریزوں کی یہ پالیسی کم و بیش 1920 تک اسی اصول پر چلتی رہی۔ 1920 کے بعد انہوں نے اس میں تھوڑی تبدیلی کی لیکن اب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ مسلمانوں نے بھی وقت کے ساتھ خود کو بدلا لیکن جو حادثہ ہوا اس نے مسلمانوں کو معاشی طور پر بالکل مفلوج کر دیا۔

(۲) سیاسی عوامل : انگریزوں نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے اس ملک میں ایک ایسا زہر گھول دیا جس سے یہ ملک آج تک ابھر نہیں سکا ہے۔ اپنی پالیسی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے تحت اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور تشدد کے ایسے رجحانات بھر دئے جس سے دونوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور نقصان پہنچانے کے مقصد کو اپنا قومی نصب العین بنالیا اور اتحاد و بھائی چارہ اور تعاون و اشتراک کی ہر آواز کی سنی ان سنی کر دی۔

یہ نفرت اور تشدد اتنا بڑھا کہ ملک تقسیم ہو کر رہا۔ لاکھوں جانوں کا زیاں ہوا اربوں کھربوں کی املاک تباہ ہوئی اور لگ بھگ ایک کڑوڑ آبادی کا انخلا ہوا۔ اس ہمہ جہتی تباہی سے سب سے زیادہ پنجاب، دہلی، یوپی، بہار اور بنگال کے مسلمان متاثر ہوئے۔ حیدرآباد، جوناگڑھ، راجستھان اور مدھیہ پردیش کے مسلمانوں پر بھی اس کا اثر ہوا گویا

پورا اتری ہندوستان اس سے متاثر ہوا۔ سکھ اور ہندو بھی اس سے متاثر ہوئے لیکن جو سکھ اور ہندو پاکستان سے ہندوستان چلے آئے انہوں نے یہاں کے لوگوں کی (خیر سگالی اور حکومت کی مدد سے خود کو جلد ہی اپنے پاؤں پر کھڑا کر لیا۔ اسی طرح جو مسلمان پاکستان مہاجر بن کر چلے گئے 1971 کی جنگ کے پہلے پہلے ان کی وہاں چاندی تھی۔ ساری محرومی، زخم، ذلت، معاشی بدحالی، سیاسی بے چارگی، ظلم اور بے وزنی ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ جس نے ان کی رہی سہی کمر بھی توڑ دی اور وہ بالکل پس ماندہ اور درماندہ ہو کر رہ گئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا وہ طبقہ جو سیاست میں سرگرم تھا اور سیاسی اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ جو بڑے جاگیردار اور زمیندار تھے۔ جو بڑی اور چھوٹی سرکاری نوکریوں میں تھے، جو اس وقت پڑھے لکھے تھے اور جو بڑے تجارت پیشہ اور کاروباری تھے یہ دیکھ کر کہ پاکستان میں ان کا مستقبل روشن ہے اپنے غریب اور بے سہارا بھائیوں کو چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر گئے ہندوستان میں جو مسلمان رہ گئے ان میں چند افراد کو چھوڑ کر نہ تو کوئی قائد تھا اور نہ کوئی سرمایہ دار۔ چاروں طرف اجڑے ہوئے مکانات تھے، جلتے ہوئے شہر تھے ایک قیامت صغری تھی جو ملت کے سر سے گذر گئی۔ اس نے انگریزوں کے وقت سے لڑکھڑائی ہوئی مسلمانوں کی معیشت کو اور بھی تباہ کر دیا۔

(۳) سماجی اور مذہبی عوامل : ہندوستان کی آزادی اور تقسیم جن جذباتی رد عمل کے نتیجے میں ہوئی اس نے یہاں کے سماجی ماحول کو بری طرح چار جڈ کر دیا تھا۔ ایک چھوٹا سے چھوٹا واقعہ بھی بہت جلد اور بڑی آسانی کے ساتھ ہندو مسلم تصادم میں تبدیل ہو جاتا۔ ہندوستان میں بعض سماجی اور مذہبی تنظیمیں اور کچھ سیاسی عناصر بھی

مسلمانوں کو دیس نکالا دینے کا نعرہ لگاتے تھے۔ ان لوگوں نے تاریخ کی جھوٹی سچی کہانیاں گڑھ گڑھ کر لوگوں کو اتنا مشتعل کر دیا اور سماج میں اتنا عدم تحمل بھر دیا کہ ہندوستان کے طول وعرض میں فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جس نے مسلمانوں کے اندر خوف بے چارگی، مایوسی اور عدم تحفظ کا احساس اتنا گہرا کر دیا کہ وہ دن رات اپنی جانوں اور مالوں کی بھیک مانگتے رہتے۔ اس ماحول میں معاشی ترقی کا خواب دیکھنا امر محال تھا۔ لہذا آزادی کے بعد فسادات کا مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی میں بڑا اہم ہاتھ ہے۔ ایک تو انہی علاقوں میں زیادہ فسادات ہوئے جہاں مسلمان معاشی لحاظ سے کچھ بہتر تھے اور فسادات کا ایک بڑا مقصد ان کو معاشی لحاظ سے مفلوج کرنا تھا دوسرے ان میں خوف اور عدم تحفظ کا احساس بھر کر آگے بڑھنے سے روکنا تھا۔ یہ دونوں حکمت عملی بہت کارگر ثابت ہوئی۔ اس حکمت عملی کو بروے کار لانے کے لئے مذہبی عوامل کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ یہ حکمت عملی آج بھی رائج ہے۔

(۴) انتظامی عوامل : سماج اور سیاست میں فرقہ واریت کا جو زہر گھلا ہے اس کا اثر انتظامی اداروں مثلاً پولس، بیوروکریسی، جوڈیشیری، پریس، تعلیمی اداروں، ثقافتی مراکز، سرکاری دفاتر، صنعتی اور تجارتی مراکز، بازار اور منڈی، بنک اور اسٹاک اکسچینج سبھی پر پڑتا ہے۔ لہذا ان تمام جگھوں پر مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھنا ایک غیر تحریری مگر مستقل لازمی اصول بن گیا۔ اس پر مستزاد اقرباپروری اور کرپشن نے سرکاری نوکریوں اور دیگر مراکز میں مسلمانوں کے دخول کو بڑی حد تک ناممکن بنادیا یہی وجہ ہے کہ کلاس ون اور کلاس ٹو سروسز ہی نہیں بلکہ کلاس تھری اور کلاس فور سروسز میں بھی مسلمانوں کا تناسب بہت کم ہے۔ مرکزی حکومت نے ایک زمانے میں

ایک سرکلر کے ذریعہ مسلمانوں کو پولس اور دفاعی نوعیت کے حساس اداروں میں شرکت سے منع کر دیا تھا۔ لہذا مسلمان پولیس، ملٹری اور دیگر انتظامی شعبوں میں بہت معمولی تعداد میں ہیں۔ اس نے مسلمانوں کو سروسز میں جانے سے روکا۔ چنانچہ مسلمانوں میں متوسط طبقہ جو خاص طور پر اسی کلاس سے آتا ہے بہت تھوڑا ہے۔

اس پالیسی سے مسلمانوں کو صرف سروسز میں ہی کم نمائندگی نہیں ملی۔ بلکہ اس کا اثر تجارت اور حرفت میں بھی دیکھنے کو ملا۔ مسلمانوں کے پاس جو روایتی صنعتیں تھیں ان کو نہ تو کچے مال ملے، نہ سرمایہ، نہ بازار اور نہ کوئی تکنیکی مدد نتیجہ یہ ہوا کہ مسابقت اور سرمایہ کے اس دور میں یہ صنعتیں دم توڑ گئیں۔ جس نے آزادی کے بعد مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی میں اضافہ ہی کیا۔

(۵) تعلیمی اور معاشی عوامل : مسلمان تعلیم کے میدان میں پچھلے دو صدیوں سے بہت پیچھے چل رہے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ان کے لئے جدید دنیا میں معاشی ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔ اس سلسلے میں نہ تو حکومت کی جانب سے کوئی خاص کوشش کی گئی ہے اور نہ کمیونیٹی کی جانب سے ہی کوئی بڑی پہل ہوئی ہے۔ اس لئے جہاں دنیا اسپوٹنگ کی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے مسلمان زمین پر گھٹنوں کے بل چلنا سیکھ رہے ہیں۔ دراصل مسلمان طرح طرح کے تعصبات، اندیشوں اور داخلی تضادات کے شکار ہیں۔ کمیونیٹی لیڈرشپ انہیں کوئی متعین سمت سفر دینے میں ناکام ہے جس کے باعث معاشی اور تعلیمی میدان میں کوئی مربوط کوشش نہیں ہو پائی۔ نتیجہ ہے کہ ملت کا معاشی جمود برقرار ہے۔ جدید تعلیم اور اس کے تقاضوں کو سمجھنا اور ملت کے لئے اس کو مفید بنانا یہ عوام کا کام نہیں بلکہ ہمارے ملی قائدین کی ذمہ داری ہے۔ لیکن یہ مسئلہ

ابھی تک ہمارے ملی ایجنڈے کا اہم نکتہ نہیں بنا ہے اس لئے اس پر جتنا دھیان دینا چاہئے ابھی اتنا دھیان نہیں دیا گیا ہے۔

میرے خیال میں یہ چند عوامل ہیں جس نے ملت کی معاشی پس ماندگی کو قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک موثر قیادت اور منصوبہ بند کمیونیٹی پہل کی ضرورت ہے۔

ملی قیادت کا مسئلہ : تقسیم ہند کے بعد قائدین کی پوری کی پوری فوج چند ایک مستثنات کو چھوڑ کر چاہے وہ مسلم لیگی رہے ہوں، کانگریسی، جمیعتہ العلمائی رہے ہوں یا جماعت اسلامی سے وابستہ یا خاکسار اور خلافت تحریک کے باقیات سب کے سب پاکستان منتقل ہو گئے۔ لے دے کے پورے ہندوستان میں ایک ہی موثر شخصیت تھی جو مولانا آزاد کی تھی لیکن وہ اتنے مجروح اور مضمحل ہو چکے تھے کہ اس ناقہ بے زمام کو سوئے قطار لے چلنا ان کے بس کے باہر تھا۔ اپنی بے بسی کا اظہار انہوں نے جامع مسجد دہلی کے اس مشہور خطبے میں کیا ہے جو آزادی کے فوراً بعد مسلمانوں کے اس گروہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا جو ڈر کر اس ملک کو چھوڑنے پر آمادہ تھا۔

"تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دئے، میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی"

لیکن مولانا آزاد ایک زبردست رجائی فطرت کے مالک تھے اور گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی امید کی شمع جلائے رکھنا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے انہوں نے مسلمانوں سے کہا :

"جس طرح آج سے کچھ پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا اسی طرح آج یہ تمہارا خوف وہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر زیادہ نہیں ابھی دیکھتی آنکھوں، ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ سورج چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے"۔

مولانا آزاد نے اضطرار و مایوسی میں ڈوبے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ "دنیا میں مسلمان مایوسی کے لئے پیدا نہیں کئے گئے وہ صرف امید کے لئے ہیں اور جس دن اس کے لئے نہ ہوں اس دن وہ مسلم بھی نہیں"۔

چنانچہ تقسیم ملک کے بعد آزاد ہندوستان میں مولانا آزاد کی ذات مسلمانوں کے لئے اس لنگر کی طرح تھی جس نے سخت طوفانی ماحول میں بھی جہاز کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ مولانا آزاد کے ان جملوں نے لاکھوں انسانوں کو جن کے قدم اس ملک سے اکھڑ چکے تھے انہیں پھر سے جما دیا اور وہ خوشی اور اعتماد کے ساتھ ملی تعمیر میں لگ گئے۔

مولانا آزاد نے ملک کی قیادت کے سامنے یہ بات کھل کر کہی کہ : "مسلمانوں کی شرکت کو بغیر اس ملک میں لیا گیا کوئی بھی فیصلہ ادھورا ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے ایک طرف مسلمانوں کو اور دوسری طرف ہندوؤں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ دونوں مل کر آزاد ہندوستان کی تعمیر نو میں اپنا کردار ادا کریں۔

مولانا آزاد نے دستور ہند کی تدوین سے لے کر وزارت تعلیم کی ذمہ داری تک اس فرض کو بڑی خوبی سے انجام دیا۔ لیکن ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو جب یہ قدآور شخصیت رخصت ہو گئی پھر اس کے بعد خاکنائے ہند سے اب تک کوئی ایسا شخص نہیں

اٹھا جس کو "قائد" کہا جاسکے۔

مولانا آزاد نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں مسلمانوں کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اپنی مشترکہ اور جمہوری شہریت میں اپنا مقام پیدا کرنے اور فرقہ پرستی سے لڑنے نیز دیگر ہم وطنوں کے ساتھ ملک کے سچے شہریوں کی طرف تعمیر و ترقی کے منصوبوں میں لگ جانے کی تلقین کی اور ان کو صاف صاف مشورہ دیا۔

"جہاں تک اس اجتماع کا تعلق ہے آپ صاف اور دو ٹوک فیصلہ کر لیں کہ آئندہ کوئی مسلم مجلس، کوئی مسلم نظام، سیاسی میدان میں فرقہ واری بنیاد پر قائم نہ کریں گے۔ کسی مجلس کے مقصد پر فرقہ واریت کی پرچھائی بھی نہ پڑنی چاہئے"۔

اور ان تمام باتوں کے عملی نتیجہ کے طور پر آپ نے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو کر ملک کی تعمیر و ترقی میں لگ جانے کا مشورہ دیا۔

مسلمانوں نے آزادی سے قبل مولانا آزاد کی بات چاہے نہ سنی ہو یا کم سنی ہو لیکن آزادی کے بعد مسلمانوں نے ان کی بات مانتے ہوئے فرقہ وارانہ سیاست کی اپنی تمام بساط لپیٹ دی اور قومی دھارے میں شامل ہو گئے۔ لیکن کانگریس نے ان کو قومی دھارے میں شامل ہونے نہیں دیا بلکہ اپنا ووٹ بنک بنا کر رکھا تا کہ اپنے اقتدار کو دوام دیتی رہے۔

دھیرے دھیرے کانگریس میں گاندھی نہرو ٹریڈیشن کے لوگ ختم ہونے لگے جنہوں نے کانگریس میں ہندؤں کی غالب اکثریت کے باوجود اسے خالص ہندو تنظیم نہیں بننے دیا بلکہ اسے تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت بنا کر رکھنے پر زور دیا کانگریس اپنے مقام اور مزاج سے ہٹ گئی اور اس میں کلیت پسندی اور اکثریتی فرقہ

پرستی کا زہر پوری طرح سما گیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے خلاف تشدد آمیز فرقہ وارانہ فسادات کی جھڑی لگ گئی اور مسلمانوں کی ہر اس چیز سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی جو اس ملک میں مسلمانوں کی مخصوص شناخت کی علامت رہے تو پھر کانگریس سے مسلمانوں کا موہ بھنگ ہو گیا اور مسلمانوں نے کانگریس کو طلاق بائن دے کر بغیر نفقہ کے گھر سے نکال دیا۔ نتیجتاً کانگریس بیشتر ریاستوں اور مرکز میں اقتدار سے محروم ہو گئی ہے۔ لیکن ابھی تک اس نے ہوش کے ناخن نہیں لئے ہیں۔ جب تک کانگریس کے رویہ میں جوہری تبدیلی نہیں آتی اور وہ جمہوریت سیکولزم اور اقلیتوں کے تئیں گاندھی نہرو روایات کی پاسداری نہیں کرتی مسلمان اس کو رجوع کر کے دوبارہ اپنے گھر لانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ حالانکہ کانگریس کی شکست صرف کانگریس والوں کا نقصان نہیں ہے بلکہ یہ ملک کا نقصان بھی ہے۔ کیونکہ کانگریس کی جگہ پر جو لوگ ملک میں اقتدار پر فائز ہو رہے ہیں ان کے پاس ملک کا کوئی آل انڈیا ویژن نہیں ہے جس میں ملک کے تمام طبقات کو ایک ساتھ لیکر چلنے کی صلاحیت ہو۔ شخصی اور گروہی مفادات، فرقہ وارانہ تعصبات اور حد درجہ بڑھی ہوئی علاقائیت سماج اور ملک کی سالمیت کے لئے زبردست خطرہ ہے۔ اس لئے کانگریس کی قیادت کو پوری سنجیدگی کے ساتھ اس ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہئے اور ایسی حکمت عملی وضع کرنی چاہئے تا کہ اس کی گم شدہ بھیڑیں اس کے ریوڑ میں واپس آجائیں۔ بہر حال یہ ایک جملہ معترضہ تھا، مجھے یہاں کانگریس پارٹی کو کوئی مشورہ دینا مقصود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں قیادت کے مسئلہ پر گفتگو کرنا ہے۔

1964 میں جبل پور (مدھیہ پردیش) میں زبردست ہندو مسلم فساد ہوا۔ یہ

آزاد ہندوستان کا اب تک کا سب سے بڑا فساد تھا جس نے پوری مسلم ملت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس وقت تمام مسلم جماعتوں اور قائدین نے مل بیٹھ کر مسلمانوں کے تحفظ وبقا کا ایک جامع منصوبہ تشکیل دیا اور ڈاکٹر سید محمود کی قیادت میں مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد رکھی۔ یہ کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی لیکن اس کا مقصد مسلمانوں میں اتحاد، استحکام، خود حفاظتی اور سیاسی شعور کی بے داری پیدا کرنا تھا۔ یہ آزاد ہندوستان میں مولانا آزاد کے بعد پہلی مضبوط اور متحدہ آواز تھی جس نے حکومت وقت کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس وقت حکومت سنجیدگی سے مسلمانوں کے مسائل پر غور کرنے کے بجائے اس فکر میں لگ گئی کہ کس طرح اس ابھرتی ہوئی متحدہ قوت کو توڑ دیا جائے۔ بہت جلدی خود ہماری صفوں سے حکومت کو جہاد انتشار کے لئے کچھ آزمودہ کار سپاہی مل گئے جنھوں نے حکومت وقت کے اشارے پر اس اسکیم کو پوری طرح سبوتاژ کر دیا۔ ڈاکٹر سید محمود کے انتقال کے بعد پھر کوئی قدآور اور موثر شخصیت ایسی نہیں تھی جس پر سب کا اتفاق ہو۔ مجبوراً مشاورت کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آئی جو نہ تو مضبوط تھے اور نہ موثر۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مشاورت ایک نحیف نزار بیمار کی طرح ہو گئی جو بستر سے اٹھنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اب تک اس کو فعال متحرک بنانے کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی ہیں ضرورت ہے کہ اس کو طبعی موت مرنے دیا جائے اور اس سلسلہ میں نئی پہل کی جائے۔

آزاد ہندوستان میں کبھی مسلمانوں کو چین کا سانس نصیب نہیں ہوا۔ فسادات کا لامتناہی سلسلہ چلتا رہا جس نے پوری ملت کو خوف ودہشت میں مبتلا کر کے مفلوج وناکارہ بنا دیا۔ ابھی ایک زخم بھرا نہیں کے دوسرے اور تیسرے زخم لگتے رہے یوپی،

دہلی، پنجاب اور دیگر ریاستوں میں اردو کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس نے اتر ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا کہ ان کی جان مال کی طرح ان کی زبان بھی محفوظ نہیں ہے۔ زبان تہذیب وثقافت کا خزینہ اور آئینہ دار ہوتی ہے۔ لہذا زبان پر حملہ گویا پوری تہذیب وثقافت پر حملہ ہے۔ آزادی سے قبل اردو ہندو مسلمان سکھ اور دیگر قوموں کی مشترکہ زبان تھی۔ لیکن آزادی کے بعد یہ صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی۔ دھیرے دھیرے اردو کے غیر مسلم ادیب وشعرا صحافی اور قلم کار رخصت ہونے لگے اور ان کے ساتھ وہ زبان ان کے گھروں سے بھی رخصت ہو گئی۔ دوسرے اردو ان کی ثقافت کا حصہ نہیں تھی بلکہ ان کی ثقافت ان کی اپنی مادری زبان میں محفوظ تھی۔ اردو سے ان کا تجارتی اور پیشہ ورانہ رشتہ تھا تاہم اردو کے لئے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً اردو کی حفاظت کرنے اور اس کو اس کا حق دلانے میں غیر مسلم حضرات بھی پیش پیش رہے اور انہوں نے اپنے قلم اور زبان سے اس زبان کی بقا کے لئے لائق تحسین خدمات انجام دیں ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اس زبان کو اپنی دینی، تہذیبی اور تمدنی زبان کا درجہ دے رکھا تھا یہ بات ان کے یہاں نہیں تھی۔ ہماری تاریخ وتہذیب اور دینی ورثے کا سارا ذخیرہ جو کبھی عربی اور فارسی میں تھا اب اردو میں ہے۔ اس لئے اردو شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک مقدس زبان کا درجہ رکھتی ہے جب حکومت نے ریاستی اور مرکزی سطح پر اردو کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی اور اکثریت کے اردو دشمن عناصر کو اس کام کے لئے ابھارا تو اس وقت بہار، یوپی، دہلی اور دیگر ریاستوں اور شہروں میں مسلمانوں نے اردو زبان کی حفاظت کے لئے زور دار مہم چلائی۔ اردو زبان سے مسلمانوں کی جذباتی وابستگی نے ایک نئی قیادت ابھارا اور

اتحاد عمل کی ایک نئی راہ ہموار کی۔ ستر کی دہائی میں اردو اس ملک کا اہم سیاسی ایجنڈا بن گئی اور اردو کو بہار یوپی اور دیگر ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کی مہم کا آغاز ہوا۔ بہار میں یہ تحریک کامیاب رہی۔ دوسرے مقامات پر بھی کامیابی کی طرف گامزن ہے۔

مسلم یونیورسیٹی علیگڑھ ہندوستان میں مسلم خودارادیت اور عصری آگہی کی علامت ہے یہ یونیورسیٹی ہمیشہ سے کنٹروورسی کا مرکز رہی ہے۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے تحریک آزادی کی راہ روکی دوسرے اس نے پاکستان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس لئے آزادی کے فوراً بعد اس یونیورسیٹی کو تباہ کرنے کی ایک زبردست کوشش کی گئی۔ اس وقت مولانا آزاد نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اس یونیورسیٹی کا وائس چانسلر بنا کر اس کی حفاظت کی۔ لیکن اس یونیورسیٹی کا اقلیتی کردار ہمیشہ سے ارباب حل وعقد کی نگاہ میں کھٹکتا رہا۔ لہٰذا اس پر شب خون مارنے کی نت نئی سازش کی گئی اور بالآخر اندرا گاندھی کے دور اقتدار میں اس کا اقلیتی کردار ختم کر دیا گیا۔ اس معاملہ میں عدلیہ نے جو کردار ادا کیا اس نے اس کے متعصب ہونے اور مسلمانوں کے معاملہ میں مجرمانہ نقطہ نظر رکھنے کی حقیقت واضح کر دی۔ مسلمانوں نے یہ لڑائی بھی پوری سوجھ بوجھ اور ضبط وتحمل کے ساتھ لڑی۔ بالآخر حکومت نے ان کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور اس یونیورسیٹی کا اقلیتی کردار کم از کم قانونی طور پر بحال کر دیا۔ لیکن اس میں اتنی سیندھ ماری ہو چکی ہے کہ یہ ایکٹ اپنی جوہری توانائی کھو چکا ہے۔ تاہم اس نے بھی اتحاد ملی اور اتحاد عمل کی ایک روشن مثال پیش کی جو قابل اطمنان ہے۔

مسلم پرسنل لاء ہندوستان میں معاندین اسلام کی آنکھ کا شہتیر بنا ہوا ہے اس

معاملہ میں آزاد خیال، فسطائی فرقہ پرست اور سیکولر جمہوریت کے علمبردار سب ہم خیال ہیں۔ خود دستور ہند کے رہنما اصولوں میں ریاست کے مقاصد علیا میں ایک مقصد تمام شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ ہے۔ حکومت نے متعدد بار اس کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن جب اسے محسوس ہوا کہ وہ قانون بنا کر اور بل پاس کر کے اس کام کو نہیں کر سکتی ہے تو عدلیہ کے ذریعہ چور دروازے سے مسلم پرسنل کو بدلنے کی ناپاک سازش کی گئی۔ شاہ بانو معاملہ میں سپریم کورٹ نے جس طرح آئین وروایات کی اندیکھی کرتے ہوئے مسلمانوں پر ایک جارحانہ فیصلہ تھوپنے کی کوشش کی، مسلمانوں نے اس معاملہ میں جس زبردست جوش اور عدیم المثال اتحاد کا ثبوت دیا اس نے حکومت کے ہوش اڑا دئے اور حکومت کو مجبور ہو کر اس فیصلہ کو کل العدم قرار دینے کے لئے پارلیامنٹ میں ایک بل لانا پڑا۔ اس تحریک سے مسلم پرسنل لاء بورڈ معرض وجود میں آیا جو مسلمانوں کی تمام جماعتوں اور مسلکوں کا ایک متحدہ پلیٹ فارم ہے۔ اس مہم نے یہ ثابت کر دیا کہ ملت میں متحد ہو کر اپنے تشخص کی جنگ لڑنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

١٩٩٢ میں بابری مسجد کا سانحہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کے لئے ایک ٹرننگ پوائنٹ ہے۔ اب تک حکومت، انتظامیہ، عدلیہ، پریس، سیکولر جماعتوں اور دیگر اداروں پر مسلمانوں کا جو بچا کھچا اعتماد تھا وہ اس واقعے کے بعد سب ختم ہو گیا اور مسلمان پہلی بار یہ محسوس کرنے لگے کہ اس ملک میں وہ پوری طرح غیر محفوظ ہیں تقسیم ملک کے بعد یہ سب سے بڑا دھکہ تھا جس نے مسلمانوں کے پورے وجود کو ہلا دیا اور اب دوبارہ ان کے سامنے یہ سوال کھڑا ہو گیا کہ اب تک وہ جس سیاسی اور سماجی عمل

کے ذریعہ اس ملک میں اپنا رول ادا کر رہے تھے وہ صحیح نہیں ہے لہذا انہیں نئے سرے سے سوچنا ہو گا۔ بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور اس طرح کی دیگر تنظیمیں وجود میں آئیں لیکن یہ اپنا مقصد پورا نہیں کر سکیں۔ بابری مسجد کے سانحہ نے جہاں ایک طرف حکومت اور اس کے اداروں پر سوالیہ نشان کھڑا کر دیا وہیں مسلم قیادت اور اس کے کردار و تاثیر پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا۔

مسلمان اس وقت سے ایک نئی قیادت اور نئے پلیٹ فارم کی تلاش میں ہیں۔ ہر جگہ لیڈر وانٹڈ کا بورڈ لگا ہوا ہے لیکن اب تک کہیں سے کوئی درخواست موصول نہیں ہوئی ہے۔ یہ تلاش ناتمام نہ سہی ناکام تو ضرور ہے۔ اقبال نے اپنی موت کے وقت یہ مصرع کہا تھا :

سرآمد روزگارے ایں فقیرے　　دیگر دانائے راز آید کہ ناید

اس دانائے راز کی تلاش ہے جو ملت کی کشتی کو اس بھنور سے نکال کر محفوظ ساحل تک پہنچا دے۔ ایسا نہیں ہے کہ جماعتیں اور ادارے نہیں ہیں قائدین کی پوری فوج کی فوج کھڑی ہے۔ لیکن اس بھیڑ بھاڑ میں وہ مرد قلندر نظر نہیں آتا۔ جس کے بارے میں اقبال نے کہا :

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر، میر کارواں کے لئے

ہمیں ایسے میر کارواں کی تلاش ہے۔ اسے دریافت کرنا ہے۔ اسے ڈھونڈھ نکالنا ہے۔ جو ملت کی شیرازہ بندی کر اس میں تحریک و اجتماعیت کی روح پھونک دے جس کا دماغ روشن، دل بڑا، اخلاق بلند ہو اور جو اخلاص و قربانی کا پیکر ہو۔ کیا پندرہ کڑور کی عظیم

آبادی میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے۔ شاید ہاں شاید نہیں۔ دراصل یہ مسئلہ اجتماعی شعور اور اتحاد عمل کا ہے۔ کام ایک فرد بھی کر سکتا ہے افراد کے مجموعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ جماعتوں اور تنظیموں کے اشتراک سے بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مشترکہ نقاط کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے شعور کی بے داری اور عوامی رابطہ کی ضرورت ہے۔ یہ کام کون کرے گا ہم آپ یا مہدی موعود۔ اگر ہم اسے مہدی موعود پر چھوڑتے ہیں تو ہمیں قیامت تک انتظار کرنا پڑے گا جبکہ ہماری حیات چھوٹی ہے۔ مسئلہ ہمارا ہے ہزاروں برس بعد آنے والی نسلوں کا نہیں اس لئے شاید اس کام کو طوعاً و کرہاً ہمیں اور آپ کو کرنا ہو گا۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں ہمیں اور آپ کو ہی رول موڈل بننا ہو گا۔

قیادت منصب نبوت نہیں ہے جو آسمان سے طے ہوتی ہے یہ زمینی عمل ہے اس لئے اس کو زمین پر طے کرنا ہو گا حقائق کی ٹھوس زمین پر۔ جذباتیت سطحیت، بے جا جوش اور احساس کمتری وغیرہ کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے یہ علم و دانش کے لیباریٹری میں تیار تجربہ کی کسوٹی پر کھری وہ کوشش ہے جس کے بغیر ہم ملت کا کوئی مستقبل طے نہیں کر سکتے۔ لہذا ماضی کے تجربات حال کے احساسات اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ لے کر ایک اجتماعی پہل کی ضرورت ہے۔

آئندہ صفحات میں اس کے خدوخال پر غور کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا حقائق و واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملت اپنے وجود اور تشخص کے باب میں بے حد حساس ہے اور جب کبھی اس کے وجود تشخص اور شناخت پر حملے ہوئے ہیں تو اپنی تمام کمزوریوں اور انتشار کے باوجود ملت نے اتحاد عمل کا ثبوت دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے ورنہ ملت پر جو قیامت خیز ادوار

گذرے ہیں اب تک اس کا نام ونشان مٹ جانا چاہئے تھا۔ لیکن یہاں ہمیں جہاں یک گونہ اطمنان ہوتا ہے وہیں یہ شعر بھی ذہن میں ہر وقت مستحضر رکھنا چاہئے کہ ۔

عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانے میں
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ایک ڈیٹر منڈ میجوریٹی (Determind Majority) جس کے پاس اسٹیٹ پاور بھی ہو وہ اگر کسی اقلیت کو مٹانے پر آمادہ ہو جائے تو دیر یا سویر وہ اس کے شناخت کی کمر توڑ دیتی ہے۔ تاریخ میں اس کی سینکڑوں مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ لہذا مسلمانوں کے سلسلہ میں فسطائی اور نام نہاد سیکولر عناصر نے جو قلیل مدتی اور طویل المیعاد منصوبہ بنا رکھا ہے اب وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لئے اس صورت حال کا جواب دینے کے لئے ایک زبردست جوابی تحریک برپا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تحریک تشدد واشتعال کی تحریک نہیں ہوگی کیونکہ تشدد واشتعال کسی تعمیری مقصد کے حصول میں معاون نہیں ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ دیرپا نہیں ہوتی تیسرے اس کے ناکام ہو جانے کا امکان قوی ہوتا ہے۔ چوتھے یہ مسئلہ وقتی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس کی فطرت میں طول ہے اس لئے یہاں صبر واستقرار کی ضرورت ہے۔ یہ جوابی تحریک اولاً لوگوں کو صحیح اور مکمل واقفیت بہم پہنچائے گی اور ان کے شعور کی آبیاری کرے گی۔ دوم ان کی صفون میں اتحاد فکر اور اتحاد عمل کی کوشش کرے گی۔ سوم جمہوری طریق کار اختیار کرے گی اور ہر قسم کے تشدد سے پاک ہوگی۔ چہارم اکثریت کے انصاف پسند طبقے کے سامنے اپنا موقف واضح کرے گی اور ان کو اعتماد میں لے کر مشترکہ جدوجہد شروع کرے گی۔ پنجم یہ تحریک قربانی دے گی اور اپنے جذبات اور قربانیون کے بل پر لوگوں کا اعتماد

حاصل کرے گی۔ ششم یہ تحریک تمام محروم اور مظلوم طبقات کو جوڑنے کی کوشش کرے گی، اس کا نعرہ ہوگا ہندوستان کے مظلوموں ایک ہو۔ ہم ظلم نہیں کریں گے لیکن ظلم کا مقابلہ ضرور کریں گے۔

اس ذہن اور دم خم کے ساتھ اگر ہم سامنے آئیں تو ہمیں اس ملک میں وہ اخلاقی حمایت حاصل ہوگی جو ہماری کمزوری کو قوت میں بدل سکتی ہے۔ ملی قیادت کا یہی وہ ایجنڈا ہوگا جو ہمیں آگے لے جاسکتا ہے۔

ہندوستان کا سٹ اور کمیونٹیز کا ملک ہے۔ یہاں زبان وثقافت کا تفاوت (Languistic and cultural diversity) نمایاں ہے۔ علاقائی امنگوں (Regional aspirationas) کو حال کے دنوں میں کافی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ جب سے کانگریس کا زوال ہوا اس کے بعد سے ملک میں کولیشن کلچر کا دور شروع ہو گیا اس وقت ملک کی کوئی پارٹی ایسی نہیں ہے جو پورے ملک میں یکساں مقبول ہو اور از خود پارلیامنٹ میں اکثریت لے آئے۔ مجبوراً اسے دیگر پارٹیوں کے ساتھ اشتراک کر کے ساجھا بنیاد پر حکومت بنانے کے لئے آمادہ ہونا ہوتا ہے۔ اس میں بعض اوقات اجتماع ضدین دیکھنے کو بھی ملتا ہے۔ ایک پارٹی اپنے اصول، ضابطے، طریق عمل، پالیسی اور تنظیمی کلچر کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہونے کے باوجود سیاسی مصالح کے پیش نظر ایک ساتھ حکومت سازی پر مجبور ہوتی ہے۔ اس صورت میں جن پارٹیوں کے پاس دو چار اور پانچ دس ممبران ہی ہوتے ہیں وہ کافی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لہذا ان کے خواہشات اور مطالبات کو نظر انداز کر کے کوئی گروہ اقتدار میں نہیں رہ سکتا۔ صورتحال کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ یہ سلسلہ ابھی دراز ہونے کا

امکان ہے اور ملک میں سیاست کا ایک نیا دوڑ شروع ہو گیا ہے۔ اس کے جہاں کچھ نقصانات ہیں وہیں کچھ فائدے بھی ہیں۔ فائدوں میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ طبقات، علاقے اور گروہ جو اپنی کم تعداد اور غیر اہم علاقائی حیثیت رکھنے کی وجہ سے بالکل حاشیہ پر تھے اور جن کو ملکی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی بلکہ جن کا جائز مطالبہ بھی نظر انداز کر دیا جاتا تھا نہ صرف یہ کہ ان کو پوری اہمیت حاصل ہو گئی ہے بلکہ اپنے مطالبات منوانے کے ساتھ ساتھ وہ اہم ملکی فیصلے میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں ہی گروہی سیاست کے لحاظ سے چاہے جتنا پریشان کن ہو لیکن ملکی سالمیت کے لحاظ سے بہت مفید ہے۔ اس طرح مختلف وارنگ گروپس اور علیحدگی پسند تنظیموں کو بھی مین اسٹریم پالیٹکس میں لایا جاسکتا ہے لہذا اس صورتحال میں ہندوستانی مسلمان اگر متحد اور منظم ہو کر ایک نئے معاہداتی سیاست کا آغاز کریں تو نہ صرف یہ کہ ان کے اب تک کے بہت سے مسائل حل ہو جائیں بلکہ وہ مشترکہ ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں اپنا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں جو ملک اور مسلمان دونوں کے لئے فال نیک ثابت ہوں گے۔

مسلمانوں نے آزادی کے بعد پچھلے پچاس سال میں اپنی الگ سیاسی جماعت بنانے کے بجائے مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر اور ان میں شامل ہو کر سیاسی عمل کو جاری رکھا کچھ مسلمانوں کی جانب سے الگ سیاسی جماعت بنانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ مسلم لیگ جو کبھی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت سمجھی جاتی تھی کیرالہ میں محدود ہو کر رہ گئی۔ اتری ہندوستان میں کوئی اس ان چاہے بچے کو گود لینے کو تیار نہیں ہے۔ یوپی میں مسلم مجلس کا قیام عمل میں آیا لیکن یہ اپنے وجود سے پہلے ہی ختم

ہو گئی۔ حیدرآباد میں مجلس اتحاد المسلمین قائم ہے لیکن جس کی اپیل انتہائی محدود ہے۔ اس کے علاوہ جب کہیں ایسی کوشش کی گئی مسلمانوں نے اس کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ مشترکہ سیکولر قیادت نہ تو ان کو تحفظ فراہم کر سکی نہ ہی ان کے تشخص اور شناخت کے حفاظت کی یقین دہانی کرا سکی اور نہ ہی ان کو ملک کے تعمیر و ترقی میں ان کا حصہ رسدی دلا سکی۔ اس کے باوجود مسلمانوں کا ابھی تک ملک کی سیکولر قیادت پر سے اعتماد پوری طرح ختم نہیں ہوا ہے اور وہ آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ چل کر ہی وہ اپنا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ لیکن جب سے مرکز میں بی جے پی کی قیادت میں ہندو فسطائی حکومت برسر اقتدار آگئی ہے اور سیکولر عناصر نے جس تیزی کے ساتھ اپنا چولا بدل کر اس اقتدار کو قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور وہ حکومت باوجودیکہ اپنی اکثریت نہیں رکھتی پھر بھی اس نے اپنے ظاہری اور پوشیدہ ایجنڈے کے ذریعہ ملک کی اقلیتوں کو جس طرح پریشان کرنے اور ہراساں کرنے کا منصوبہ بند سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ دستور میں ترمیم، تاریخ کی از سر نو ترتیب، نصاب تعلیم کی نئی تدوین، مخصوص کلچر کو تھوپنے کی کوشش، تبلیغ مذہب اور تبدیل مذہب پر پابندی، عدلیہ، پولس، پریس، فوج اور انتظامیہ میں کھلے عام جارحانہ فرقہ پرست عناصر کے شمولیت کی اجازت، عبادت گاہوں کی تعمیر و تزئین پر پابندی وغیرہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی جبکہ ان کو پوری اکثریت حاصل نہیں ہے تب تو وہ اس طرح کی حرکتیں کھلے عام اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ کر رہے ہیں جب ان کو واضح اکثریت حاصل ہو جائے گی اس وقت ان کی فسطائیت نازیت ہٹلر اور موسلینی کی طرح بالکل تیغ برہنہ بن جائے گی اس وقت اس ملک کی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کا کیا ہوگا؟ تعجب اس پر

نہیں ہے کہ بی جے پی ایسا کر رہی ہے یہ تو اس کی پالیسی ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ وہ سیاسی پارٹیاں جو خود کو سیکولر کہتی ہیں اور محض ایک پولٹیکل ارجمنٹ کے تحت بی جے پی کے ساتھ ہیں وہ ان تمام باتوں پر یا تو خاموش ہیں یا ان کا احتجاج اتنا مدھم ہے جس سے ان کے عزائم پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ لوگ بھی اس اسکیم میں شریک ہیں، ان کی معمولی مخالفت محض ایک دکھاوا ہے تاکہ اقلیتیں یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حمایتی ہیں اور ان کا ووٹ بنک محفوظ رہے۔ لہذا یہی وہ بدلی ہوئی صورتحال ہے جس نے اس بات پر سوچنے پر مجبور کردیا کہ شاید تمام نام نہاد سیکولر جماعتیں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے مفادات کی محافظت نہ کرسکیں اس لئے ان اقلیتوں کو بالخصوص مسلمانوں کو اپنی حفاظت آپ کرنے کے اصول پر عمل کرتے ہوئے کچھ فیصلہ کن قدم اٹھانا ہوگا۔

لیکن ملت کا موجودہ انتشار اس معاملے میں سب سے بڑی روکاوٹ ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں نہ تو فرد کی سطح پر کوئی ایسا شخص ہے جس کو مسلمانوں کا قائد مانا جائے اور نہ جماعت کی سطح پر کوئی نمائندہ جماعت ہے۔ لہذا ایک ایسی اجتماعیت کیسے برپائی کی جائے جو ایک موثر قیادت فراہم کرسکے یہ وقت کا سب سے اہم سوال ہے۔ یہ بات اوپر واضح کی جاچکی ہے کہ ہندوستان کاسٹ اور کمیونیٹی کا ملک ہے۔ لہذا اس وقت ملک میں مختلف کاسٹ، کمیونیٹی اور علاقوں کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعتیں موجود ہیں مثلاً بی جے پی اور کانگریس بالعموم فورورڈ ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ آر جے ڈی، جے ڈی، سمتا، ایس پی وغیرہ جماعتیں بیک وارڈ ہندوؤں کی نمائندہ ہیں۔ بی ایس پی اور ریپبلکن پارٹی ہری جنوں اور دلتوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ جھارکھنڈ اقلیتی

مورچہ آدی باسی گروہوں کی نمائندہ ہے۔ ڈی ایم کے، ٹی ڈی پی، آسام گن پریشد، ترنمول کانگریس اور نیشنل کانفرنس علاقائی عزائم کی ترجمان ہیں۔ شوسینا، مہاراشٹری قومیت کی علمبردار ہے۔ اکالی دل سکھوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ غرض ملک میں اس وقت لگ بھگ ۵۶ سیاسی جماعتیں ہیں جو کسی نہ کسی گروہ اور علاقے کے مفادات کی نمائندگی کرتی ہیں اس صورت میں اگر کسی ایک آبادی جس کی کوئی نمائندہ جماعت نہیں ہے تو وہ مسلمان ہیں جو اتنی بڑی تعداد میں ہوتے ہوئے اور لگ بھگ ایک سو سے زیادہ پالیامانی سیٹ پر اپنی فیصلہ کن قوت رکھنے کے باوجود اپنی کوئی الگ نمائندہ جماعت نہیں رکھتے۔ ملک کے حالات جس تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں اس اوپشن کو بھی سامنے رکھنا چاہئے۔

ایک مشترکہ مسلم قیادت کیسے برپا کی جاسکتی ہے؟ یہ سوال مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ ملک میں ایسے کئی تجربات ہوئے ہیں جس کی روشنی میں ایک نئی پہل کی جاسکتی ہے۔ آزادی سے قبل کانگریس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کانگریس ایک پارٹی کم اور ایک پلیٹ فارم زیادہ رہی ہے۔ اس میں متضاد بلکہ متحارب خیالات کے لوگ ایک ساتھ مل کر ایک مشترکہ مقصد ہندوستان کی آزادی کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ اور ان کی مشترکہ کوششوں سے ہی ملک آزاد ہوا ہے۔ جب کسی شخص کو مقصد عزیز ہوتا ہے تو وہ اپنے مخصوص اصول اور نظریہ پر قائم رہتے ہوئے بھی مشترکہ مقصد کے حصول میں مل جل کر جدوجہد کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کی آزادی کسی فرد یا جماعت یا گروہ کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ متضاد اور بسا اوقات متحارب گروہ کا ایک مشترکہ قیادت اور پلیٹ فارم کے تحت جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ جب

اس طرح ایک بڑی بیرونی استعماری قوت سے آزادی حاصل کی جاسکتی ہے تو اس طریق کار کے تحت ایک ملت کی بقا کا انتظام کیوں نہیں کیا جاسکتا ہے ؟

ابھی اوپر بی جے پی کی قیادت میں موجودہ کولیشن حکومت کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بی جے پی ایک انتہا پسند ہندو فسطائی تنظیم ہے جو اپنا مخصوص ایجنڈا رکھتی ہے۔ جب بی جے پی نے یہ محسوس کرلیا کہ اس کے ایجنڈے کے ساتھ جلدی کوئی جماعت اس کی حمایت کے لئے تیار نہیں ہے تو اس نے اپنے ان مخصوص ایجنڈے کو جس سے ملک کی دیگر سیاسی پارٹیاں الرجک تھیں کنارے کردیا اور ایک کامن فیمم پروگرام کی بنیاد پر ایک وسیع ترکولشن کی تعمیر کی اور ۲۴ پارٹیوں کے اشتراک سے حکومت سازی کی۔ کیا ہم ان دونون تجربات سے فائدہ اٹھا کر مشترکہ ملی محاذ قائم نہیں کرسکتے ؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت پورے ہندوستان میں نہ تو مقامی سطح پر نہ ریاستی سطح پر اور نہ ہی مرکزی سطح پر کوئی ایسی شخصیت ہے جس کو ملی قائد کہا جاسکے۔ ہمارے یہاں مختلف جماعتیں، ادارے، مسالک اور برادریاں ہیں جن کا الگ الگ مرجع ہے۔ بسااوقات ان کے درمیان آپس میں ہم عصرانہ چشمک اور اختلاف رہتا ہے۔ ایسے مواقع بہت کم آتے ہیں جبکہ یہ سب ایک ساتھ مل بیٹھیں۔ قیادت کے خلاء نے جہاں ایک طرف ملت کو شتر بے مہار بنادیا ہے وہیں یہ ایک ایسا گلہ ہو گئی ہے جس کا کوئی گلہ بان نہیں ہے اس لئے بڑی آسانی سے ہوس کے بھیڑئے ہمارے بھیڑوں کا شکار کرلیتے لیں اور ہم سینہ کوبی کرکے اور آنسو بہا کر رہ جاتے ہیں۔

میرے خیال میں قیادت پیدا نہیں کی جاتی بلکہ قیادت پیدا ہوتی ہے۔ جس

شخص میں قائدانہ صلاحیت ہوگی وہ اپنی قیادت منوالیگا۔ اس لئے اگر کوئی قائد ہوگا تو خود سامنے آئے گا۔ ہمیں اس کی تلاش و جستجو میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن ابھی ایسا کوئی شخص نہیں ہے اور کسی شخص کے سر پر زبردستی یہ تاج رکھ دینا مناسب بھی نہیں ہے۔ قیادت جس فطری پروسس سے پروان چڑھتی ہے اسی کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں میں ایک مشترکہ قیادت ابھارنے کا ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں میں جتنے مسالک ہیں، جماعتیں اور ادارے ہیں اور مسلمانوں کی جتنی برادریاں ہیں وہ جمہوری عمل کے ذریعہ اپنے اپنے قائدین کا انتخاب کریں اور منتخب شدہ یہ قائدین اپنا ایک وفاق بنالیں۔ اپنی جماعتی، مسلکی ادارتی اور برادری کے شناخت کو باقی رکھتے ہوئے اور اپنے مخصوص دائرے کار میں اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے ملت کو سیاسی اور سماجی مسائل میں رہنمائی دینے کے لئے ایک کامن فیمم پروگرام طے کرلیں اور مشترکہ امور و مسائل پر مشترکہ موقف رکھتے ہوئے سماجی بے داری، عوامی تنظیم اور مقصدی جدوجہد کا آغاز کریں۔ اختلاف ونزاع کی صورت میں ایک ایسا ضابطہ طے کرلیں اور اس کے لئے ایک ایسا فورم تشکیل دیں جہاں وہ ان امور پر اپنے اختلافات دور کرکے مشترکہ حکمت عملی کے تحت اپنی مفوضہ ذمہ داریاں انجام دے سکیں۔ میں مانتا ہوں کہ ایسا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے سخت کاوش اور قربانی درکار ہے لیکن میرے خیال میں اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ہے یہ کام کسی ریاست میں تجرباتی سطح پر شروع کیا جاسکتا ہے اگر یہ کوشش کامیاب رہتی ہے تو دوسری ریاستوں اور مرکزی سطح پر بھی اس کو بروئے کار لایا جاسکتا

ہے۔

قائدین کا جو وفاق بنے اس میں تمام اکائیوں کی نمائندگی برابر ہونی چاہیے یہ قائدین باری باری سے اپنے میں سے کسی ایک شخص کو صدر الصدور قائد اعلیٰ منتخب کرلیں جس کی مدت کارکردگی دو یا چار سال ہو۔ یا پھر ایک پریسڈیم (Presidium) ہی بنالیں جس میں سب یکساں اختیارات اور حقوق کے ساتھ شریک ہوں۔ یہ قائدین آپس میں باہم مشورے سے مختلف شعبوں کے ذمہ دار ہوں لیکن ہر کوئی اس وفاق کے سامنے جوابدہ ہو۔ بہتر ہو کہ تمام امور اتفاق رائے سے انجام پائیں۔ بصورت دیگر جو امور باہمی مشورے سے مگر کثرت آراء سے طے ہو جائیں اس میں جس شخص کو اختلاف ہو یا وہ اس شرط پر کہ عوام الناس کے سامنے اس کی مخالفت نہیں کرے گا اس کے عملی پروگرام میں شرکت سے رخصت کی اجازت ہوگی۔ جہاں تک ہو سکے دوست داری، توسع، تحمل، صبر اور رازداری کا طریقہ اختیار کیا جائے اور تمام لوگوں کے درمیان براہ راست تعلق رہے تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہو اور اگر کوئی غلط فہمی ہو تو اس کا بروقت ازالہ ہو سکے۔ بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تجویز بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی طرح موثر تو ضرور ہے لیکن سوال یہ ہے کہ گھنٹی باندھے گا کون اور گھنٹی بندھے گی کیسے؟

اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ باشعور نوجوانوں اور دانشوروں پر مشتمل ایک ٹیم ترتیب دی جائے اور یہ ٹیم تمام جماعتوں، مسالک اور برادریوں کے موجودہ ذمہ داروں اور قائدین سے ملاقات کرے اور ان کے سامنے اپنی تجویز رکھے ان سے تبادلہ خیالات کرے اور ان کے مشوروں کی روشنی میں آگے کی حکمت عملی طے کرے۔ پھر

ان تمام لوگوں کو ایک جگہ جمع کرے۔ ان کے سامنے مشترکہ امور و مسائل کی ایک فہرست رکھے۔ اس کے حل کا ایک طریق کار پیش کرے، غور و خوض اور باہمی تبادلہ خیالات کے ذریعہ چند متعین ایشوز اور متعین طریق کار کے ساتھ عملی جدوجہد کا آغاز کرے اور اس طرح مسلم سوشل اور پالیٹیکل امپاورمنٹ کے متعین مقصد کے حصول کی جدوجہد کا آغاز کرے۔ میری نظر میں یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے جس کے ذریعہ ہم ایک مشترکہ ملی قیادت برپا کر سکتے ہیں۔ میں مانتا ہوں جس دن ہم نے یہ مسئلہ حل کر لیا انشاء اللہ ہمارے دیگر مسائل کے حل کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

اس مقصد کے لئے ایک پر عزم جدوجہد کے آغاز کی ضرورت ہے۔

خلاصہ کلام : اوپر کے مباحث سے جو بات ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے بنیادی طور پر تین مسائل ہیں :

(۱) تشخص اور شناخت کا مسئلہ
(۲) تحفظ اور حفاظت کا مسئلہ
(۳) ترقی و استحکام کا مسئلہ

ان تینوں مسائل کے حل کی تین صورتیں ہیں :

(۱) تعلیم اور شعور کی بیداری
(۲) تنظیم و تحریک
(۳) تدبیر و عمل

کسی چیز کی حفاظت کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں ایک داخلی اور دوسری خارجی۔
جب تک ہم داخلی محاذ پر مضبوط نہیں ہوں گے محض خارجی کوششیں ہمارے تشخص

کو محفوظ اور برقرار نہیں رکھ سکتی ہیں۔ دین کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ ہم دین اور شعائر دین نیز فرائض دین کی بجاآوری پوری تندہی سے کریں۔ نماز کا اہتمام مسجدوں کی حفاظت کی ضمانت ہے۔ ہم اردو زبان کی حفاظت چاہتے ہیں اس کا فروغ چاہتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے اب حکومت اس کو دوسری نہیں پہلی سرکاری زبان بھی بنادے تو اس سے اس کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ ہم مسلم پرسنل لاء کی حفاظت چاہتے ہیں اس کے لئے ہم نے زبردست تحریک چلائی اور حکومت کو ہم نے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کردیا لیکن اگر ہم اپنے معاملات پرسنل لاء کے تحت حل نہ کریں نکاح، طلاق، وراثت وصیت، نفقہ، مہر، عدت اور متاع کے معاملہ میں شریعت کو توڑ کر اور اس کو چھوڑ کر عملاً اس کی نفی کردیں جیسا کہ ہم اس وقت کررہے ہیں تو محض سیاسی شعبدہ بازی سے کب تک ہم شریعت اسلامی کو مٹنے سے روک سکتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم صاحب ایمان ہیں، منافق اور جھوٹے نہیں ہیں تو اخلاص کے ساتھ اس پر عمل کرنا چاہئے یہی ہمارے تشخص اور تحفظ کی اصلی ضمانت ہے۔ کسی بھی جمہوری ملک میں کوئی حکومت عوام کی مرضی کے خلاف بالخصوص کسی ایسی چیز کے خلاف جس پر لوگ عامل ہوں کوئی قانون نافذ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔ لیکن جب لوگ ہی اس کو بغیر کسی جبر ودباؤ کے اس وقت چھوڑدیں گے جبکہ ان کو اس پر عمل کی پوری قانونی اور دستوری آزادی دی گئی ہے تو حکومت اس صورتحال سے فائدہ اٹھاکر اگر اس قانون کو یہ کہہ کر بدل دے کہ چونکہ لوگ اس پر عامل نہیں ہیں اس لئے ایسے کسی قانون کی ضرورت نہیں ہے تو اس پر واویلا کرنے کا ہمیں کوئی قانونی اور اخلاقی حق نہیں رہے گا۔

کسی قانون یا اصول پر عمل نہ کرنے کی دو ہی سیدھی سادی وجوہات ہو سکتی ہیں ایک یا تو لوگ اس قانون سے واقف نہیں ہیں یا پھر سماج میں اس کا چلن نہیں ہے۔ ہر دو صورت میں اگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ قانون یا اصول صحیح ہے تو ہمیں لوگون کو اس سے واقف کرانے اور سماج کا چلن بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے لئے تنظیم اور تحریک کی ضرورت ہوگی اور تعلیم واتحاد کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے یہاں چونکہ زبردست جہالت ہے اور اس پر مستزاد مختلف وجوہات سے انتشار فکر اور انتشار عمل بھی پایا جاتا ہے اس لئے اس جہالت کو دور کرنے اور اتحاد کی فضا پیدا کرنے کی شعوری اور سنجیدہ کوشش ہونی چاہئے اس کے لئے اخلاص اور دلجمعی کی ضرورت ہوگی۔ ماحول اتنا بگڑا ہوا ہے کہ جلدی کسی پر کسی کو اعتبار نہیں ہوتا اس لئے باہم مل بیٹھنے کی ایک فضا بنانی ہوگی اور ایک دوسرے پر اعتماد کرنے کا گر سیکھنا ہوگا۔

اس وقت ملک میں جو جماعتیں اور ادارے اپنے اپنے دائرے میں جو خدمات انجام دے رہے ہیں ان پر زبان طعن و تنقید دراز کئے بغیر ان کی کوششوں میں تعاون دے کر اور اپنی کوششوں میں تعاون لے کر یہ فضا بنائی جاسکتی ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہے اس لئے کہ غلط فہمیاں اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے دور نہیں ہوں گی لیکن اس کا کوئی شارٹ کٹ راستہ نہیں ہے اور ہمیں اس راہ کو اپنا کر اپنی منزل کی طرف آگے بڑھنے کی جدوجہد کرنی ہوگی۔

اگر ہماری ملت تعلیم اور اتحاد سے آراستہ ہوجاتی ہے تو ترقی کی راہ خود بخود ہموار ہوجائے گی اس وقت ہمیں صرف چیزوں کی نشاندہی کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ایک تعمیر پسند ماحول میں لوگوں کی سوچ خود بخود تعمیری ہوجاتی ہے، منفی عوامل اور

تخریبی رجحانات از خود دب جاتے ہیں لیکن ہمیں یہ باور رکھنا چاہئے کہ ہم کسی خلا میں کام نہیں کررہے ہیں بلکہ ایک مشترک اور متضاد سماج میں کام کررہے ہیں جہاں ایک دوسرے کی فلاح کے مسئلہ کو خواہ مخواہ لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف سمجھ رکھا ہے۔ یہی فرقہ پرستی اور فسطائیت ہے اور اس وقت ملک میں اسی کا بول بالا ہے۔ اس صورت میں نہ صرف ملت کے اندر اعتماد واتحاد کی فضا بنانے کی ضرورت ہے بلکہ اکثریت کے اندر بھی تعاون واعتماد کی فضا بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ملی تعمیر کے طریقوں کی بازیافت کے ساتھ ساتھ اکثریت سے وسیع تر رابطہ، ان کی بھلائی اور خبر گیری، مشترکہ امور ومسائل میں تعاون واشتراک اور آگے بڑھ کر ان کی مدد کا داعیہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ ہم کاٹنے اور کٹنے والے نہ بنیں بلکہ جوڑنے اور جڑنے والے بنیں۔ ہماری مثال اس درخت کی ہونی چاہئے جس کی جڑیں مضبوط اور گہری ہوں۔ جس کی شاخیں گھنی اور پھیلی ہوں جس کا سایہ ٹھنڈا اور پھل میٹھا ہو۔ اگر ہم اس طرح ہندوستان میں اپنے وجود کو پیش کرسکے تو ہم اس ملک کے لئے بوجھ نہیں باعث رحمت ہوں گے اور اگر ایسا ہوگیا تو ہماری موجودہ زبوں حالی، خوش اقبالی میں تبدیل ہوسکتی ہے۔

غربت، جہالت، سماجی ناانصافی، امن وقانون کا مسئلہ، بے روزگاری اور بیماری، علاقائی عدم توازن، فرقہ واریت اور فسطائیت، غیر متناسب نمائندگی، جبر واستحصال یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ پورے ملک کا اور اس کی بہت بڑی آبادی کا مسئلہ ہے اس ملک کے دلت، آدی باسی، پس ماندہ ذات اور برادریوں کے لوگ اسی طرح ظلم واستحصال کے شکار ہیں جس طرح مسلمان ہیں۔ عدم تحفظ کا مسئلہ

ملک کی بڑی آبادی کا مسئلہ ہے۔ سکھاڑ اور باڑھ سے سب پریشان ہیں۔ فرقہ واریت اور فسطائیت ملک کی بڑی آبادی کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ لہذا ان مسائل میں ہمیں سب سے الگ تھلگ ہوکر نہیں سوچنا چاہئے اور صرف اپنی بچاؤ اور تحفظ کے لئے فکرمند نہیں ہونا چاہئے بلکہ چونکہ ہم خیر امت ہیں جو لوگوں کی بھلائی کے لئے ہی برپا کی گئی ہیں اس لئے اپنی بھلائی اور حفاظت سے زیادہ دوسروں کی بھلائی کی فکر کرنی چاہئے۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر قیادت کرنے کا جوہر کھودیا ہے اس لئے آج ان کو یہ دن دیکھنے پڑرہے ہیں۔ ہمارا خدا رب العالمین ہے ہمارا رسول رحمت العالمین ہے اس لئے ہمارا وجود خیر العالمین ہونا چاہئے جس کا فیض سورج، ہوا اور پانی کی طرح عام ہو۔ ہمیں خود کو یہ سبق پڑھانا ہے اور اس پر عامل ہونا ہے۔ یہی چیز ہمارے امپاورمنٹ کو بڑھائے گی۔ کٹر سے کٹر انسان بھی اپنے محسنوں کی قدر کرتا ہے اس کی حفاظت اور خدمت کرتا ہے۔ ہم ذرا مایوسیوں کو تج کر اور اپنی خود غرضیوں سے اوپر اٹھ کر کچھ سوچنے اور کرنے کو تیار تو ہو جائیں پھر دیکھئے کیسے دیکھتے دیکھتے حالات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس عمل میں دقت نہیں ہے آزمائش نہیں ہے۔ مشکلیں نہیں ہیں بلکہ وہ تمام مرحلے جو کسی تحریک کا خاصہ ہوتے ہیں آپ کے راستے میں بھی آئیں گے۔ مگر آپ کو اگر یقین ہے کہ آپ کی راہ درست ہے اور آپ صحیح سمت سفر میں چل رہے ہیں تو آزمائشوں اور اختلاف سے گھبرا کر اپنی راہ کھوٹی کرلینا یا راستہ بدل دینا کسی دانش مند فرد اور قوم کا شیوا نہیں ہے۔ اللہ نے ان سخت حالات میں ہمیں وقت کا امین بنایا ہے اور ہمیں اس عہد اور ان حالات میں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا موقع دیا ہے جس کی ایماندارانہ بجاآوری ہماری دنیا اور آخرت دونوں کو بہتر بنانے گی۔ اس لئے میری

گذارش ہے کہ قرآنی طرز فکر اختیار کی جائے، سنت کو اپنا طرز عمل بنایا جائے۔ دین کو اپنی راہ بنائی جائے اور انسانیت کی خدمت کو اپنا مقصد زندگی بنایا جائے تو ملت اسلامیہ ہند کا مسئلہ بھی حل ہوگا اور ہم انسانیت عامہ کے نجات دہندہ بھی بن سکتے ہیں۔ ہماری موجودہ زبوں حالی کو دور کرنے کی میرے نزدیک یہی ایک راہ ہے۔ میں ان امور پر تمام صاحبان فکر و فہم کو غور کرنے اور اگر یہ باتیں صحیح ہوں تو اس کے لئے مشترکہ جدوجہد کرنے کی اپیل کرتا ہوں۔

☆☆☆☆